ادارۂ فکرِ جدید، نئی دھلی ۱۱۰۰۰۲

قیمت : پچھتر روپے -/75

سن اشاعت : 1985ء

تعداد : ایک ہزار

خوشنویس : جمال گیاوی

سرورق : فضیلت

طباعت : جواہر آفسیٹ پرنٹرز۔ دہلی۔

ناشر :

ادارۂ فکرِ جدید

922۔ کوچہ رُوہیلا (پہلی منزل)

ترا ہا بہرام، دریا گنج، نئی دہلی۔ 110002

FAIZ AHMED FAIZ : By : K.K. KHULI

Criticism : 1985 Price Rs.75.00

IDARA FIKRE JADEED
922, Kucha Rohella (Ist Floor)
Tiraha Behram, Daryaganj
New Delhi-110002

فہرست

ضمیمہ جات

فہرست تصاویر

اِنقلاب آئے گا دبے پاؤں

کافی ہاؤس موہن سنگھ پیلیس دہلی میں محفل جمی ہوئی تھی۔ کافی کوئی منگوا نہیں رہا تھا۔ بات فیض پر چل نکلی۔

"آخر کون سی گیدڑ سنگھی تھی فیض کے پاس کہ بغیر کسی انقلاب کے انقلابی شاعر قرار دے دیا گیا؟"

جوگا سنگھ نے صرف ایک کافی کا آرڈر دیتے ہوئے سنسار سنگھ گریب سے پوچھا۔ جوگا سنگھ پنجابی کا شاعر ہے اور اُردو کا اچھا شعر سننے کے لیے گھنٹوں اُردو کی ٹیبل پر بیٹھا انتظار کرتا ہے۔ جوگا سنگھ کے دادا نے انگریز حکومت کے خلاف انقلاب کا نعرہ بلند کیا تھا جس کے بدلے اسے پھانسی کی سزا ملی۔ اُس وقت اس کے دادا کی عمر بھگت سنگھ سے بھی کم تھی لیکن جوگا سنگھ کہتا ہے کہ تاریخ میں اس کے دادا کا نام نہیں آیا۔ کسی نے اس کی شتابدی نہیں منائی۔ جوگا سنگھ کا یقین انقلاب سے اُٹھ گیا ہے۔ اب وہ دیوی جاگرن کراتا ہے۔ دفتر میں بڑے افسروں کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے رات کو دن اور دن کو رات کہتا ہے۔ بینگن والے قصے پر عمل کرتا ہوا دو پروموشن لے چکا ہے۔ پارٹ ٹائم جیوتش کرتا ہے۔ جنم پتریاں بنواتا

ہے۔ بچے انگریزی اسکول میں پڑھتے ہیں اور بیوی ٹیلی فون ایکسچینج میں نوکری کرتی ہے۔ قصہ کوتاہ جوگا سنگھ ڈی۔ ڈی۔ اے کے فلیٹ میں رہتا ہے اور عیش کر رہا ہے۔ بھلا یہ سب انقلاب سے کیونکر ہو سکتا تھا؟ جوگا سنگھ کہتا ہے کہ انقلاب کوئی ٹُلا ہوا قلیچہ نہیں ہے جو ہر ڈھابے پر بکتا ہے۔ انقلاب بہت مہنگی شے ہے جو امیروں اور اسمگلروں کی ذہنی عیاشی کا سامان بن کے رہ گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جوگا سنگھ یہ جاننے کے لیے بے تاب ہے کہ فیض کے پاس کون سا ایسا مقناطیس تھا کہ سارا برصغیر اس کو انقلابی شاعر ماننے کے لیے تیار بیٹھا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ فیض صاحب نے انقلاب کو ایک آدمی پکنک سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ انھیں سے انقلاب شروع ہوا انھیں پر ختم ہوا۔ پھر یہ کیسا اعجاز مسیحائی ہے کہ سب کچھ ہاتھ پیر ملائے بغیر ہو گیا نہ ہینگ لگی نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا۔ لیکن جس سے اس نے سوال پوچھا ہے اس کا کیس کچھ ٹیڑھا ہے۔

سنسار سنگھ گریب جس نے اپنا تخلص اپنے بریف کیس پہ کھدوا رکھا ہے۔ ڈی جی ایس ٹی کے دفتر میں کلرک تھا۔ وہ بھی انقلاب لانا چاہتا تھا۔ انقلابی شاعری کرتا تھا۔ ایک دن اس کے افسر نے اسے اپنے کمرے میں بُلا لیا اور کہا: ——— "سنسار سنگھ انقلاب کو کچھ دیر کے لیے روک دو تمہارا نام پروموشن کے پینل میں آچکا ہے" ——— وہ دن اور یہ دن بیچ میں سنسار سنگھ ایک اور پروموشن لے چکا ہے۔ اب جبکہ سنسار سنگھ کو پروموشن کا چسکا پڑ گیا ہے وہ زمین آسمان کے قلابے ملا سکتا ہے لیکن انقلاب کی بات نہیں کرتا۔ سنسار سنگھ کا شک اب یقین میں بدل گیا ہے کہ انقلاب یا تو اب طوائف کے کوٹھے سے اُٹھے گا یا ڈی ایم ایس کے کیوسے۔

اپنی پگڑی سیدھی کرتے ہوئے بولا: ——— "بھئی انقلاب پر تو چاتن صاحب سے پوچھیے، وہ بھی تو انقلاب لانا چاہتے تھے" ——— یہ کہہ کر گریب راجہ تل کی قسم کھاتے ہوئے ٹیبل سے اُٹھ گیا۔

سی آر چاتن عرف چاتن گوبند پوری خالص پنجابی ہیں اور پنجابی شاعری کی نس نس پہچانتے ہیں۔ ہر صبح آل انڈیا ریڈیو سے ان کے گیت پشپا ہنس یا اجیت کور گاتی ہے۔ جب میں نے ان کو استاد دامن کی موت کی اطلاع دی تو ساری شام ان کو چپ سی لگ گئی۔ چاتن صاحب نے ریٹائرمنٹ کے بعد انقلاب کی باتیں چھوڑ دی ہیں۔ پنشن کرایہ اور چھوٹی موٹی کوئی اور نوکری سے ان کی گاڑی چل رہی ہے۔ ہنس کے بولے: ——— "محکمۂ انقلاب میں نے اب نادان صاحب کے حوالے کر دیا ہے۔ سارے اُردو ادب میں بس ایک ہی تو شاعر ہے جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہے" ———

اندر سروپ دت نادان کا ابھی تک صرف ایک مجموعہ شایع ہوا ہے لیکن ۲۳ مجموعے والے کو ہر

روز ڈاٹمتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی کی واردات یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ادب میں ۲۳ شعر بھی اگر اچھے ہوں تو چل جاتے ہیں۔ انقلاب کے لیے تو ایک ہی کافی ہے۔ لیکن انقلاب کس رنگ کا آئے گا۔ لال، جوگیا، ہرا، پیلا۔ ۔ ۔ ؟

میں انقلابیاں چوں انقلاب لیانڈا
تے بھائی تیری گل ورگا

لال گالوں والی بھابی تو پاکستان رہ گئی۔ آج بھابی کے گال تو گلابی بھی نہیں ہیں۔ اس بچاری کے گال تو پچک گئے ہیں۔ گلہ بھی تو اپنے بھابی سے ہی ہے۔ نادان آج چپ ہیں ضرور دفتر میں لے دے ہوگئی ہوگی۔ میں نے سوچا آج فیض نادان کے ہاتھوں بچ گئے ورنہ وہ اس کے انقلاب کا بھارتیہ کرن کر دیتے۔ ان کا کہنا ہے کہ چین میں انقلاب امریکہ لایا ہے اور افغانستان میں روس۔ جوں جوں ان کی پنشن نزدیک آتی جاتی ہے ان کا عقیدہ انقلاب میں پختہ ہوتا جاتا ہے اور اگر انقلاب کا مطلب کھانسی ہے تو ڈاکٹر محمد یعقوب کے پاس اس کا شرطیہ علاج اور ریڈی میڈ نسخہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کبھی پرگتی شیل کوی تھے۔ آج صرف شیل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ انقلاب اس ملک میں کبھی آیا ہی نہیں۔ چھوٹے موٹے بوٹ کلب ٹائپ اندولن ضرور چلے ہیں۔ مار کٹائی بھی ہوئی ہے اور لاٹھیاں گولیاں بھی چلیں لیکن عین اس وقت جب انقلاب آنا ہوتا ہے۔ معاملہ کچھ ایس ایکس ہو جاتا ہے۔ اقبال عمر اس تھیوری کو نہیں مانتا ——— "انقلاب کوئی ٹائم بم تو ہے نہیں جو عین وقت پر پھٹے گا۔ انقلاب دبے پاؤں نہیں اعلانیہ آئے گا۔"
اقبال نے سگریٹ کی راکھ کو نہایت ہی پنجابی انداز میں ڈاکٹر یعقوب کے پھٹے بوٹوں پر جھٹکاتے ہوئے کہا:
"بھئی ہم لکھنؤ کے ضرور ہیں لیکن صاف کہیں گے کہ فیض نے اپنی مادری زبان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ جہاں تک انقلاب کا تعلق ہے اس سے بڑا اردو مانی انقلاب تو فراق صاحب لا چکے ہیں ——— فانی کو لیجیے، انقلاب تو چھوٹی چیز ہے وہ تو اردو میں ستھارسس (تطہیر) لا چکے ہیں۔ ان کی شاعری میں موت، میت، کفن کچھ اس طرح آتے ہیں جیسے آسمان پر بادل یا کافی ہاؤس میں شاعر۔"
بیچ میں گوبند بول پڑا: ——— "کیا یہ سچ ہے کہ فیض صاحب چھپکلیوں سے ڈرتے تھے ——— ؟" گوبند دہلی یونیورسٹی سے ایم فل ہندی کر رہا ہے اور چاننن کو اپنا استاد مانتا ہے۔ جب کسی سے جواب نہ بن پایا تو خود ہی وضاحت کرنے لگا۔
"میجر محمد اسحق (فیض صاحب کے جیل کے ساتھی) کے بیان کے مطابق فیض چھپکلیوں سے خوف کھاتے تھے۔ اپنے مضمون "روداد قفس" میں لکھتے ہیں:
ایک دن ہم سب برآمدے میں چارپائیاں ڈال کر سونے کی تیاریوں میں تھے کہ فیض صاحب

نے دفعتاً اِدھر اُدھر چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ عطا کی چارپائی پاس ہی تھی۔ اس نے سوچا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ہاتھ کی طرف دیکھا تو سگریٹ سلگ رہا تھا۔ فیض صاحب کی نظروں کا پیچھا کیا۔ دیکھا کہ اُن کی نظریں بار بار چھت کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ وہ چارپائی کے پاس آتے رکتے اوپر دیکھتے تھے اور گھوم کر پھر وہی عمل دُہراتے تھے۔ عطا نے چھپکلی کو دیکھ لیا اور اُٹھ کر فیض صاحب کی چارپائی کھینچ کر ایک طرف کر دی"۔ —————

خواجہ احمد عباس بینڈکوں سے گھبراتے ہیں ——— "بھائی غضب کر دیا" ——— محمد عصیم نے ٹیبل پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ——— "کیا ریسرچ کی ہے۔ صرف کافی سے کام نہیں چلے گا کم سے کم کٹلٹ ہونی چاہیے" ——— گوبند نے بیرے کی بجائے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ باہر دھیمی بارش ہو رہی تھی اور ہوا میں خنکی تھی۔ عین اُس وقت کرشن موہن وارد ہوئے۔ انقلاب کے آسیب سے وہ آج تک چھٹکارا نہیں پا سکے۔ کرشن موہن انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اردو میں ۲۳ انقلاب لا چکے ہیں اُردو پہنتے ہیں نہ اُردو اوڑھتے ہیں لیکن اُردو خدمات کے کئی انعام حاصل کر چکے ہیں۔ لدھیانہ میں ہیرو سائیکل سے لے کر اُردو اکیڈمی دلی تک۔ آج کل وہ کافی پتلے پڑے ہوئے ہیں۔ انقلاب کو ٹرک میں لاد کر جمنا پار اپنے نئے مکان میں لے گئے ہیں۔ جب بھی کافی ہاؤس آتے ہیں، بشیر احمد کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ نئے پبلشر کی تلاش میں ہیں لیکن اُردو میں ہر نیا پبلشر مصنف کے پرانے پبلشر سے پوچھ کر ہی آگے بڑھتا ہے۔ کرشن موہن اپنے آپ کو سیالکوٹ کا بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ فیض کی اُردو ناقص ہے۔ جگہ جگہ غلطیاں ہیں۔ اکثر اشعار مفہوم سے عاری ہیں۔ آرایش لفظی کی بہتات ہے۔ عربی اور فارسی کے الفاظ کے بے وجہ استعمال نے ان کی شاعری کو بوجھل بنا دیا ہے۔

اسی خامی کو رشید حسن خاں اس طرح بیان کرتے ہیں:

——— "اِس شوقِ فضول نے اُن کے کلام میں بہت سے معائب کا اضافہ کیا ہے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خیالات میں تنوع کی کمی کو کثرتِ الفاظ سے پورا کرنا چاہتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے کلام میں غیر ضروری اور غیر مناسب الفاظ کا اوسط بہت بڑھ گیا ہے۔ اِس مجموعی آرایشِ لفظی میں وہ اس طرح کھو جاتے ہیں کہ اکثر مقامات پر الفاظ کے صحیح معانی اور مناسب محلِ استعمال سے قطع نظر کر لیتے ہیں۔ یہی نہیں۔ بے جا نمایش کے اِس کھیل میں وہ اِس قدر از خود رفتہ ہو جاتے ہیں کہ ان کو یہ بھی محسوس نہیں ہوتا

کہ خاص خاص لفظوں اور ترکیبوں میں پر دے سے معنویت رہے بھی؟ اور پڑھنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ یہ شخص عربی اور فارسی کے معانی و محل کے استعمال سے واقف بھی ہے؟ انھوں نے اس سلسلہ میں اس کثرت کے ساتھ فاش غلطیاں کی ہیں کہ اس خیال کا پیدا ہونا لازم ہے۔"

مندرجہ ذیل اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

ہم پہ وارفتگیِ شوق کی تہمت نہ دھرو
ہم کہ رمّازِ رموزِ غمِ پنہائی ہیں!
اپنی گردن پہ بھی ہے رشتہ فگن خاطرِ دوست
ہم بھی شوقِ رہِ دلدار کے زندانی ہیں

——— جرسِ گُل کی صدا

بہ قول رشید حسن خاں "پُرشور الفاظ کا ہجوم سامنے ہے" رمّازِ رموزِ غمِ پنہائی " بڑی مرعوب کن ترکیب ہے اور بہت بلند آہنگ مگر افسوس کہ معنی سے محروم ہے۔ غمّاز کے وزن پر رمّاز گھڑ لیا گیا ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ بجائے خود یہ کوئی لفظ نہیں محض ذہنی مغالطہ ہے۔ تیسرے مصرعے میں گردن پر خاطرِ دوست کا رشتہ فگن ہونا بھی آرائشِ لفظی کا دل پسند مشغلہ ہو سکتا ہے مگر افسوس ہے کہ یہ بھی محض غیر متناسب لفظوں کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ معروف شعر ہے:

رشتہ اے در گردنم افگندہ دوست
سی برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اس شعر کی بنیاد پر خاطرِ دوست کا رشتہ بنا کر اس کو اپنی گردن پہ ڈالا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ میری گردن پر خاطرِ دوست رشتہ فگن ہے۔ کوئی حد ہے اس بھدے پن کی اس رعایت لفظی کی اور بہت سے لفظوں کو جمع کرنے کے شوق کی۔"

داورِ حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

اُن پردہ نشینوں میں ڈاکٹر محمد اقبال کا نام صفِ اوّل میں ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے بھی ایسی غلطیاں عام کی ہیں۔

"تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی"۔

"آپ ہی خودکشی" تو ایسے ہی ہوئی جیسے لڑکے سائنس رُوم کے کمرے سے باہر نکلتے ہیں یا روزے ماہ رمضان کے مہینے سے شروع ہوتے ہیں۔

اقبال کو دار و رسن کے لالے تو نہیں پڑے لیکن ان کو بچانے والے بہت تھے —— تاریخ یہ بتاتی ہے کہ کچھ تو اپنی سزا کو پہنچ گئے کچھ اپنی جزا لے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فیض صاحب فیض ایوبی کے نام سے مشہور ہوئے اور انقلاب عشق کی حد کو پار نہ کر سکا۔ چاند نے اکثر فیض صاحب کے کانوں میں کچھ نہ کچھ کہہ ڈالا اور فیض صاحب نے جھکے ہوئے چاند کو مزید جھکا دیا۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ محبت حُسین آنسو وارد ہوئے۔ محبت حسین آنسو کی تقدیر میں محبت کم، اور آنسو زیادہ ہیں۔ دولت رام زخمی کی طرح چھوٹے قد کے ہیں بات چھوٹی اور صاف کرتے ہیں۔ دانتوں کی پوری پلیٹ مصنوعی ہونے کے باوجود ہنسی جعلی نہیں ہے۔ بولے "ہم تو فیض کے انقلاب اور اورنگ زیب کی سادگی کو ایک ہی زمرے میں رکھتے ہیں۔ نہ فیض انقلابی تھے اور نہ اورنگ زیب سادہ۔ سادگی کے لیے عطّار کے لونڈے کا ہونا کوئی ضروری نہیں رہا۔ یہاں اورنگ زیب کی عالمگیری بھی فیل ہو جاتی ہے۔ عالمگیر کے پرسنل باڈی گارڈ دستے جو اپنی کمروں پر سونے کی پیٹیاں باندھے مخملی اور سنہری کامدار کپڑے پہنے لمبی سنہری آستین چڑھائے لیے سنہری کالروں کے ساتھ ہمیشہ کھڑے رہتے۔ شیواجی کو قتل کرنے کے لیے ایک سونے کی خاص تلوار تیار کروائی تھی جسے وہ عالمگیری تلوار کے نام سے پکارتا تھا۔ دربار والے دن دربار کی چھتیں دیواریں اور ستون ہیرے جواہرات سے آراستہ کیے جاتے۔ تختِ طاؤس کو دُلہن کی طرح سجایا جاتا۔ سر پر سُرخ مخمل کی ٹوپی جس میں لعل اور موتی جڑے ہوئے پوشاک سفید ریشمی اور عمامہ زرتار پر موتیوں کی مالا۔ پیشانی پر ہشت پہلو خوش رنگ ہیرا لٹکتا ہوا۔ شاہی تخت کے سامنے جلاّدوں کا سردار فولاد خاں اپنے چالیس ساتھیوں کے ساتھ شانوں پر نیزے اور ہاتھوں میں چمڑے کے کوڑے لیے تیار بر تیار رہتا۔ تین سو ہاتھی جن کے ماتھے سیندور سے لیپے ہوئے اپنا ایک پیر اُٹھا کر عالمگیر کو سلامی دیتے۔ نئے آنے والوں کا شاہ کو سلام کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی داہنی ہتھیلی کو زمین پر ٹکا کر آہستہ آہستہ اُٹھتے ہوئے اپنے آپ کو سیدھا کرتا ہوا اپنی اس ہتھیلی کو اپنی پگڑی سے تین بار لگائے۔ معافی مانگنے کا طریقہ کچھ اس طرح تھا کہ معافی کا خواستگار اپنے گلے میں پٹکا ڈالی کر منہ میں گھاس کا تنکا رکھ کر عالمگیر کے قدموں سے لپٹ جائے اور اس وقت تک نہ چھوڑے جس وقت تک شاہ معاف نہ کر دیں۔"

"بھائی میں کہتا ہوں کہ اورنگ زیب کی سادگی جعلی تھی۔ فیض کا انقلاب بھی جعلی تھا بیوہ کے سنگار

کی طرح - اگر آپ نظام حیدر آباد کو سادہ کہیں تو میں ماننے کو تیار ہوں - مخدوم کو سادہ کہیں تو کچھ بات ہے - یہ کیا ہوا کہ دو سو سال کی زمین داری کے بعد بتی جمہوریت کو چلی - بھائی جب ترقی پسندوں نے غزل کو قدامت پسندی کی علامت قرار دے دیا تو فیض نے غزلیں کیوں لکھیں اور وہ بھی عشقیہ غزلیں - پھر غزلیں ایسی ہیں کہ نظمیں لگتی ہیں اور نظمیں ایسی جنھیں لوگ غزل سمجھ کر داد دے بیٹھے - کمال تو یہ ہے کہ غزل کو غزل اور نظم کو نظم نہیں رہنے دیا - یہ کارنامہ قتیل شفائی نے بھی بڑی کامیابی کے ساتھ سر انجام دیا ہے - شعوری طور پر وہ انقلابی شاعر بننا چاہتے تھے لیکن غیر شعوری بہاؤ انھیں دوسری طرف لے گیا - فیض اردو ادب کے ہملٹ بھی ہوتے تو کچھ بات بن جاتی لیکن وہ تو ڈاکٹر جیکل اور ہائیڈ کا رول ادا کرتے رہے -

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

بات خواہش اور ضمیر کی نہیں بلکہ گفتار اور کردار کی ہے، کہنے اور عمل کرنے کی ہے - اب فیض صاحب کی کم گوئی کو لیجیے - فیض صاحب پاکستان سے باہر نکلے ہونا شروع کر دیا - لندن میں تو وہ کیا کیا باتیں کر جاتے تھے - ماسکو میں تو انھوں نے اپنی کشتی کئی بار بادبانوں کے سپرد کر کے دریائے ماسکو اور جینیوا میں غوطے لگائے -

فیض صاحب کی پہلے دور کی شاعری نہایت ہی قسمیہ قسم کی شاعری ہے - بات بات پر قسم کھاتے ہیں - ہر شعر میں اقرار ہے - ویسے بھی "نہ" کرنا انھوں نے کبھی سیکھا ہی نہ تھا - نتیجہ یہ نکلا کہ کئی لڑکیاں ان کو غلط سمجھ بیٹھیں - ان دنوں فیض صاحب ریاضی میں کمزور تھے - غم جہاں کا حساب کرنا شروع کرتے ہیں تو کسی دوسرے حساب میں کھو جاتے ہیں - لسانی سانچوں کو رومانی سانچوں پر قربان کر دیتے ہیں - اور پھر وہی ہوتا ہے جس کا انھیں ہمیشہ خدشہ لگا رہتا ہے یعنی کہ کچھ بھی نہیں ہوتا - ادبی سراغ رسانوں کا کہنا ہے کہ فیض جب کبھی بازار گئے پبلشروں سے کبھی نہیں ملے اور نہ ہی کوئی خریداری کی جیسے گئے ویسے آ گئے -

بات ابھی چل رہی تھی کہ شکیب نیازی آ پہنچے - کہاں میسور کہاں دلی؟ انھیں بھی آج ہی آنا تھا - انھوں نے ایک نئی تھیوری پیش کی - کہنے لگے جس کی جسمانی صحت اچھی ہو وہ کبھی انقلاب لا ہی نہیں سکتا - لہٰذا نادان اور بیال سے کوئی خدشہ نہیں البتہ ڈاکٹر یعقوب سے خبردار رہیے حالات - نے ان کی شخصیت کو گیہوں کی طرح پیس کے رکھ دیا ہے - وہ یہ بھی کہہ گئے کہ اگر کوئی شخص لکھنے کی دھمکی دے تو اسے دھمکی نہیں بلکہ گیدڑ بھبکی سمجھنا چاہیے - کچھ لوگ برسوں سے نہ لکھنے کے عارضے میں مبتلا ہیں اس لیے کبھی کبھی ان پر لکھنے کا دورہ پڑتا ہے - کچھ لوگ کتابیں مرتب کرنے میں دن رات جٹے ہوئے ہیں اور انعام پا رہے ہیں - انعام بھی ایک ریکٹ ہے اتر پردیش میں ایک حضرت ہیں جن کا یہ دھندا کافی چلا ہوا ہے - دس ہزار کی رسید لیتے ہیں، انعام دو ہزار سے

زیادہ نہیں دیتے۔ جب یہ انعام پانچ ہزار تھا تو گرد و نواح کے کچھ آدمیوں کو ملا تھا۔ جب دس ہزار ہوا تو جس کو ملا نہ وہ دریبہ کا تھانہ بلّی ماران کا۔ — اگر یہاں کا ہوتا تو دہلی اکیڈمی اس کو نگل جاتی۔ اُردو کے انقلابی پروانوں کو تو یہ دُکھ ہے کہ فیض صاحب کی قبل از وقت موت سے ان کا انقلاب ادھورا رہ گیا۔ اگر چند روز اور جیتے رہتے اور انھیں نوبل پرائز مل جاتا تو ان کے انقلاب کی بھی تکمیل ہو جاتی۔

جانے سے پہلے شکیب انوار رضوی سے گلے ملے۔ لکھنے کا وعدہ لیا اور یہ جا وہ جا۔

افسردہ شام گُل ہوئی جاتی تھی لیکن جاتے جاتے وہ اس کو سُلگا گئے۔ — باقر مہدی کے حوالے سے کہہ گئے کہ فیض بنیادی طور پر رُومانوی ہی نہیں بلکہ ایک معنی میں روایتی بھی ہیں۔ فیض نے کوئی نقاب نہیں پہنی اور نہ ہی شاعری سے ان کا تعلق بہ آسانی جوڑا جا سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی پاپولیریٹی کا راز ہی رُومانیت ہے۔

اب چونکہ باقر مہدی کا ذکر آ ہی گیا ہے تو ان کی بھی بات سُن لی جائے۔ لکھتے ہیں:

"جیسے جیسے فیض کی خاموشی طول کھینچتی جا رہی تھی یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ وہ شاید محفل میں آنا پسند نہ کریں گے۔ سردار جعفری کا "نئی دُنیا کو سلام" کا اثر پھیلتا جا رہا تھا۔ یہ وہی زمانہ ہے کہ ندیم تک جعفری کے رنگ میں آزاد نظمیں لکھ رہے تھے۔ فیض کی "صبحِ آزادی" کافی مقبول ہو چکی تھی اور حسبِ دستور ساحر نے اس رنگ میں اپنی نظم "مفاہمت" لکھ لی تھی۔ مگر یہ انتہا پسندی کا دور تھا اور فیض اپنی ساری دل کشی کے باوجود ترقی پسندوں کے ہراول دستے میں شامل نہیں تھے۔ فیض نو مارچ ۱۹۵۱ء کو گرفتار کر لیے گئے: ورنہ یہ خبر ادبی حلقوں میں سنسنی پھیلا گئی اور فیض کے نام ترقی پسند شاعروں نے نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ حتیٰ کہ سردار جعفری کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ بھی "مدّاحین" کی فہرست میں شامل ہو گئے۔ فیض کی شہرت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ممتاز حسین نے اپنی کتاب "ادبی مسائل" کا انتساب "دستِ صبا" کے نام کیا ہے۔ اُس وقت انھوں نے فیض پر چند جملے بھی نہیں لکھے تھے گو بعد کو انھوں نے دو مختصر مضامین "دستِ صبا"، ۵۰ء اور "زنداں نامہ"، ۵۰ء پر لکھے جو اُن کی کتاب "ادب

اور شعور" میں شامل ہیں۔ مجھے ۵۳ء کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس (دہلی) یاد ہے جس میں ہر طرف "دستِ صبا" کا چرچا تھا کیونکہ مارچ ۵۳ء میں جعفری کی "ترقی پسند ادب" اور مجروح کی "غزل" بھی شایع ہوئی تھی مگر ذکر زیادہ تر فیض کا ہوتا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ امن کے موضوع پر ہر ترقی پسند شاعر کے پاس کئی نظمیں ہوتی تھیں۔ مارچ کے پہلے ہفتے میں اسٹالین کی موت کی خبر آئی اور شہر گونج گیا۔ اس رات نہ جانے کتنی نظمیں اور افسانے لکھے گئے اور فیض کا ذکر کچھ کم ہو گیا ہے۔"

گوبند پھر بیچ میں بول اٹھا:

"میں مانتا ہوں کہ آج کے دور میں کوئی دوسرا نہیں رہا۔ انقلابی شاعر بھوک اور پیاس کے دور سے گزرے لیکن فیض صاحب کی زندگی تو بہت آرام دہ رہی ہے۔ ہر نعمت ان کو ملی ہے۔ جیل سے نکل کر انھیں پاکستان گورنمنٹ کے ساتھ کوئی خاص شکایت نہیں رہی۔ گورنمنٹ نے بھی ان کو ستانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ رہائی کے بعد کی زندگی کافی رنگین رہی ہے۔ جہاں گئے ہیرو کی طرح استقبال ہوئے۔ کہتے ہیں جب وہ ہندوستان آئے تو خاص کر چنڈی گڑھ اور بمبئی میں ان کا ایسا استقبال اور خاطر تواضع ہوئی کہ کسی راجہ یا نواب کی نہ ہوئی ہو گی۔"

فیض صاحب کی سیاست کی بات چل نکلی۔ جتنے سوال اتنے جواب
"کیا یہ سچ ہے کہ فیض کشمیر کو پاکستان کا اٹوٹ حصہ سمجھتے تھے؟"
"تو اور کیا ہندوستان کا حصہ سمجھتے؟"
"بھئی بھارت نواز تھے۔ کہتے تھے کہ برصغیر کی تاریخ ایک ہے۔"
"ہاں تاریخ تو ایک ہے لیکن جغرافیہ ایک نہیں ہے۔"
"یہ تو ان کے ساتھ زیادتی ہے۔ ہمارے دوست تھے لیکن اپنے دشمن تو نہیں تھے۔"
"لیکن روس میں نکتہ چیں ادیبوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے اس کے خلاف بھی تو کبھی نہیں بولے کبھی روسی دوستوں سے یہ نہیں کہا کہ افغانستان چھوڑ کر چلے جاؤ۔"

"دراصل سارے اردو ادب میں فیض ہی ایک ایسا شاعر ہے جس کی سیاست کے بارے میں ہمیشہ دو رائیں رہیں گی۔"

"اس وقت تک جب تک راولپنڈی سازش کیس کھل کر سامنے نہیں آجاتا۔"

"لیکن کچھ ہو وہ ایک بڑا شاعر تھا۔"

فیض انقلابی نہ ہی لیکن سرفروش ضرور تھا۔ وہی باقر مہدی جس نے کبھی یہ کہا تھا کہ موجودہ نسل اور فیض کے درمیان ایک سمندر حائل ہو چکا ہے فیض کے مرنے پر آج آنسو بہا رہا ہے:

آخر سرخ سبز پیڑ گرا
شاخیں ٹوٹی سی سوکھی تھیں
زردی مائل سیاہ پتے تھے
پھر بھی تھا دور دور تک سایہ
اور جب سب طرف نظر ڈالیں
خار ہی خار ہیں جہاں جائیں
فیض رخصت ہوئے مگر اب بھی
ایک ہم تم کے اشک ریز صدا
ہم شکستہ دلوں سے کہتی ہے
مونس بے زبان جری لوگو!
خوف سے ڈر کے چپ نہ رہ جانا
نظریں اب ڈھونڈتی ہیں ایک کرن
ایک زخمی سیاہ سرخ کرن
جانے کب توڑ کر حصارِ نہاں
ہم کو پھر سے جری بنائے گی
سرفروشی کا فن سکھائے گی

ن، م، راشد نے ایک بار فیض صاحب کے بارے میں کہا تھا کہ: ـــ
"... فیض احساسات کا شاعر ہے مرکزی نظریات کا نہیں ـــ" فیض سے جب پوچھا گیا کہ اچھی شاعری کے لیے کن چیزوں کا ہونا ضروری ہے تو کہنے لگے کہ: ....."سب سے پہلے تو

بڑھئی کا کام آنا چاہیے اگر وہ نہیں آتا تو کچھ نہیں ہوگا۔ فن کا معاملہ تو بعد کا معاملہ ہے۔ ایک طرف فن دوسری طرف موضوع۔ دونوں مل کر جتنا بڑے کاتب جا کے شاعری پیدا ہوتی ہے —— " اس حساب سے تو بیدی بڑا شاعر بنتے بنتے رہ گیا کیونکہ وہ بڑھئی کے بجائے مکینک کے کام میں آگے بڑھ گیا جیسے سنگھ رام گڑھیا بڑھئی ہونے کے باوجود بھی شاعر نہ بن سکا۔ لیکن کچھ بھی ہو فیض صاحب کی بڑھئی والی تھیوری ہے بڑی دلچسپ۔

محبت حسین آنسو کی باتوں پر آپ آنسو بہائیں یا محبت برسائیں کافی ہاؤس کے ایوانِ ادب میں جھاڑو پھیر گئے اس کا کہنا ہے کہ : —— " اردو میں تنقید کی جاگیرداری ختم ہونی چاہیے فیض کی شاعری کو اوپر سے پہننے والے نام نہاد ترقی پسندوں کا عہد ختم ہو گیا۔ اردو میں کوئی نئی چیز لاؤ ۔"
آنسو صاحب کہتے ہیں کہ جس ملک میں سانپ کو بھی دودھ پلانے کا رواج ہو وہاں زہر گھولنے کی جلدی کیا ہے۔ سچ بولنے کے لیے تو ساری زندگی پڑی ہے اور فیض صاحب کے انتقال کو جمعہ جمعہ ابھی آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ بقول داغ دہلوی :

نظر کا تیر جگر میں رہے تو اچھا ہے
یہ گھر کی بات ہے گھر میں رہے تو اچھا ہے

اب گھر کی بات بھی سن لیجیے :

۱۳ فروری ۱۹۸۵ء کو فیض صاحب کی سالگرہ تھی۔ سنا ہے پاکستان کی حکومت نے سالگرہ منانے پر پابندیاں لگا دیں۔ فیض کی زندگی اور کارناموں سے متعلق پیش کیا جانے والا ایک پروگرام موسیقی منسوخ کرنا پڑا کیونکہ حکام کا رویہ خوشگوار نہ تھا۔ پنجاب سرکار نے ہفتہ وار " عوامی جمہوریت " کو نوٹس دیا ہے کیونکہ اس نے ۲۷ اپریل کے شمارے میں فیض کی نظم کیوں شائع کی —— ممکن ہے پاکستان آج بھی اس مردِ شاعر سے دہشت زدہ ہے لیکن ہندوستان میں فیض کا جنم دن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ یہاں وشو ہند پریشد نے ایک شخص کی دکان بند کر کے ریموٹ پابندی کی دکان کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دونوں خبریں ایک ہی دن یعنی ۱۰ اپریل کے پرچوں میں شائع ہوئی ہیں۔ ابھی خبر کا چھپنا ہی تھا کہ بھارتیہ راشٹریہ سنگھ کا بیور

نے لیموں فروش لیکمعک کو دس ہزار روپے اور سو رنے کے پانی کا
ناریل پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔"

ولیشنو پربھاکر ایک قصہ ۱۹۳۶ء کا سناتے ہیں :

"کسی ساہتیہ پریمی نے جب اشک صاحب کو کوی سمیلن میں بلایا
تو انھوں نے کہا کہ میرے پاس تو کوی سمیلن لائق کوئی کپڑے ہی
پہننے کو نہیں ہیں۔ لہذا نئی پوشاک منگوائی گئی اور اشک صاحب نے
اپنا کلام سنایا ——"

ویسے بھی اشک صاحب اس وقت سے لکھ رہے ہیں جب مثال کے طور پر راجندر سنگھ بیدی محسن لاہوری کے نام سے اخبارات میں مضمون لکھتے تھے اور اسی نام سے شاعری کرتے تھے۔ اشک صاحب کی عمر اس وقت ۷۵ سال کی ہے اور ایک سو ایک کتابیں لکھ چکے ہیں جنہیں ساہتیہ اکاڈمی کا نہیں بلکہ سنگیت ناٹک اکاڈمی ایوارڈ مل چکا ہے۔ اشک وہ شخص ہے جس کی اردو کی کہانیوں کے مجموعے کا پیش لفظ منشی پریم چند نے لکھا تھا۔ اشک صاحب ایل ایل بی ہیں اگر وکالت بھی کرتے تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ فیض کو وہ آل انڈیا ریڈیو میں جنگ کے دوران دیکھا کرتے تھے۔ آج فیض صاحب کو اُن کے مداح نوبل پرائز دلوانے کے چکر میں ہیں اور اشک صاحب لیموں بیچ رہے ہیں۔ اشک صاحب میں یہ خوبی ضرور ہے کہ اپنی ناؤ ایک تھالو نہیں باندھتے۔ گرتی دیواروں میں کود پڑتے ہیں۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد کل ملا کر ان کو ساہتیہ میں سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ ملا ہے۔

نوبل پرائز کے بارے میں فیض صاحب کیا رائے رکھتے تھے۔ ذرا دھیان سے سنیے :

"نوبل پرائز تو ویسے ہی رنگ رہے۔ ہمیشہ اس میں کچھ سیاسی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ پھر اس میں رشوت بھی چلتی رہے۔ اب دو دفعہ امیدواروں کی لسٹ میں ہمارا بھی نام آیا۔ اتنے اتنے بڑے لوگوں کی موجودگی میں بڑے لوگوں کو دے دیا جاتا ہے۔ وہاں پر سفارشیں اور رشوت دونوں ہی چلتی ہیں۔"

سفارش اور رشوت صرف لینن پیس پرائز میں نہیں چلتی۔ شاید فیض صاحب یہ کہنا چاہتے تھے۔ ویسے فیض صاحب کا پانچ سالہ پلان میں بھی کوئی اعتقاد نہیں تھا۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ :

"محض الیکشن کروا لینا ووٹ لے لینا، انھیں گن لینا، الیکشن جیت جانا

اور پارلیمنٹ بنا لینا یہ تو اوپر کا نقشہ رہے بجائے اس کے کہ ہم
جمہوریت کو بناتے اور اسے آگے بڑھاتے ہم نے اسے محدود کر دیا
ہے نام تو جمہوریت رہا لیکن نظام کوئی اور تھا جمہوریت اسی لیے
یہاں چلی ہی نہیں۔ دراصل ہمارے ہاں جمہوریت آئی ہی نہیں
اور ہم نے آنے بھی نہیں دی۔"

فیض صاحب سے امید تھی کہ اپنی سوانح عمری ہی لکھ جاتے لیکن کمیونزم اور سوانح عمری ایک میان میں
دو تلواروں والی بات ہے۔ دراصل دقت یہ ہے کہ فیض صاحب نے اپنی زندگی کے سب سے اہم واقعہ یعنی
راولپنڈی سازش کیس پر کچھ لکھا ہی نہیں۔ ان کی زندگی کا وہ باب ایک ایسا بھیگا ہوا کاغذ ہے جس پر پرانی
کہانی نہ پڑھی جاتی ہے اور نہ نئی کہانی لکھی جا سکتی ہے۔

کافی ہاؤس کی روشنیاں مدھم پڑ چکی تھیں۔ بیرے اپنی وردیاں اتار چکے تھے۔ اور بڑی تیزی سے
ٹیبلیں دوسرے دن کے انقلاب کے لیے سمیٹ رہے تھے۔ ہماری ٹیبل کے بیرے رتن کو انقلاب زیادہ
ٹپ پر یقین ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اس اردو کی ٹیبل پر ٹپ اس برساتی ندی کی طرح ہے جب بھرتی ہے تو
دریا اور جب سمٹتی ہے تو ریت بن جاتی ہے۔ لیکن آج اس کا یقین ڈگمگا گیا ہے۔ آج جب اسے ٹپ کی بے حد
ضرورت تھی کسی نے ٹپ نہیں دی۔ کل وہ کہہ رہا تھا کہ اس کی بیوی سخت بیمار ہے اور وہ آپریشن کے لیے روپے
اکٹھا کر رہا ہے۔
اس نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔
جاتے وقت صرف یہی پوچھا:
"جب انقلاب آئے گا تو کیا مجھے ٹپ زیادہ ملے گی؟"
یہ کہہ کر اس نے موہن سنگھ پیلیس کی شمعیں گل کر دیں۔ اور کافی ہاؤس کے لیے تواب کواڑوں کو
مقفل کر دیا۔ وہ کل نہیں آئے گا کیونکہ کل شام اسے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔

○○
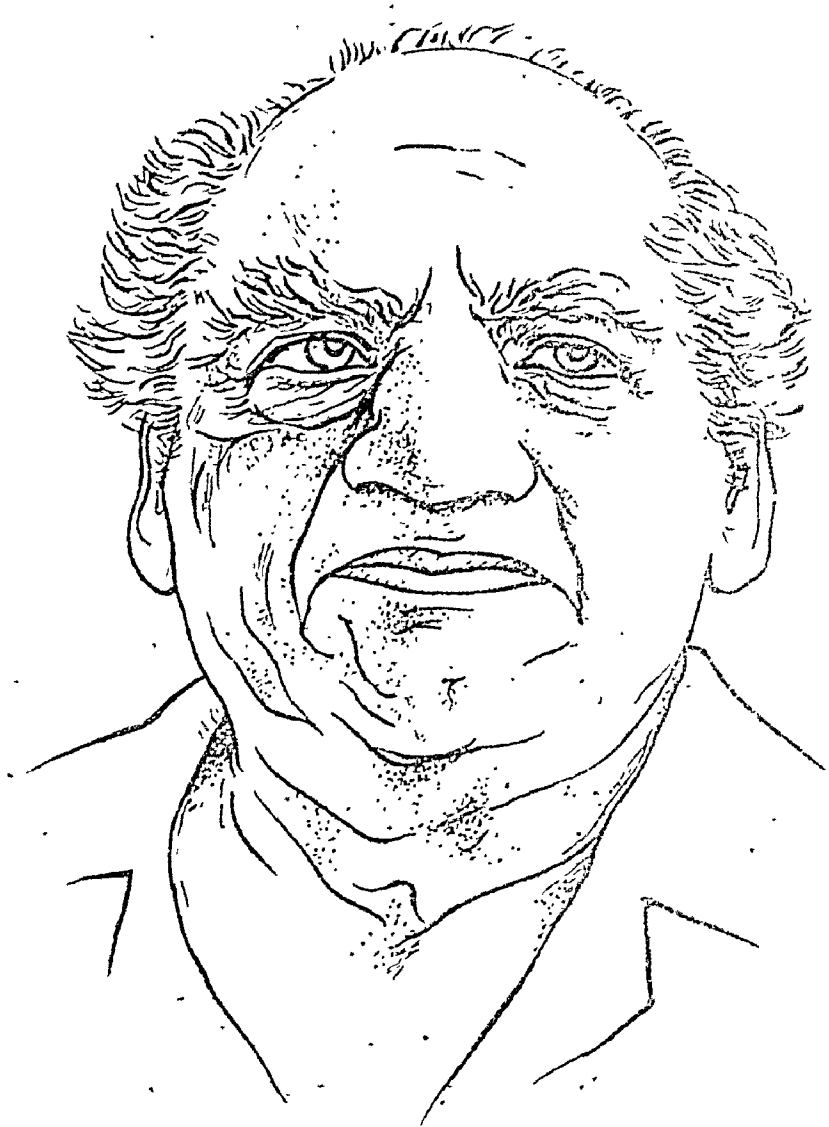
فیض احمد فیض

تیرگی ہے کہ اُمڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر

——— نقشِ فریادی

اُردو ادب میں فیض احمد فیض کو ترقی پسند تحریک کا قطبی ستارہ کہا جاتا ہے۔ مخدوم محی الدین ان سے دو پائیدان نیچے ہی رہ گئے تھے کیونکہ زندگی نے ان کے ساتھ وفا نہیں کی۔ جاں نثار اختر چار پائیدان نیچے تھے۔ سردار جعفری اور فیض کے درمیان تو کئی پائیدانوں کا فرق نظر آتا ہے۔ اگرچہ وہ پہلے پہل فیض کی شاعرانہ عظمت سے منکر تھے اور محفلوں میں بڑے سے بڑا پتھر مارنے سے نہیں چوکتے تھے۔ سخت سے سخت تنقید کرتے تھے۔ لیکن فیض کی دن دوگنی اور رات چوگنی مقبولیت اور قدر و منزلت کو دیکھ کر آخر انھوں نے اپنے آپ کو تبدیل کر لیا۔ پہلے وہ چاہتے تھے کہ فیض گستاخ نگاہی والی شاعری نہ کریں، جذبۂ بے اختیار کی باتیں نہ کریں، سمندر آنکھوں کو اپنے تصور سے نکال دیں۔ اور گلشن کا کاروبار رومانٹک موڈ میں نہیں بلکہ سنجیدہ ہو کر چلائیں۔ ٹھیک تولیں، اور ڈنڈی نہ ماریں۔ قصہ کوتاہ وہ چاہتے تھے کہ فیض رومان سے منہ موڑ لیں۔ لیکن جب فیض صاحب نے رومان سے منہ موڑنے کے بجائے رومان سے اور زیادہ منہ جوڑ لیا تو سردار جعفری نے اپنی ہی لائن بدل لی، نعرہ آمیز شاعری کو ترک کیا، رنگین کپڑے پہنے اور پربھو بھجن کو چل نکلے۔ فیض کو راہِ راست پر لاتے لاتے خود ان کے پیچھے ہو لیے۔ ترقی پسند شاعری کو چھوڑ وہ بھی جام اور گل و لالہ کی باتیں کرتے رہے۔ رومانیت کچھ بھی ہو نشیلی چیز ہے . . . چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ یہاں بھی تقدیر نے پورا ساتھ نہیں دیا کیونکہ انھوں نے رومانی ہونے کے اعلان میں ذرا دیر کر دی۔ ادھر فیض کی شاعری ڈیڑھ آتشہ ہو چکی تھی اور اسی حساب سے اُن کی شہرت میں بھی

اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ کئی یا دن گز لمبے شاعروں سے آگے نکل چکے تھے۔ سردار جعفری کافی تیز گام ہیں لیکن فیض نامی محمل ان کے ہاتھ نہ آیا۔

آج اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ترقی پسند شاعری اور فیض یہ دونوں اردو ادب میں لازم و ملزوم نظر آتے ہیں۔ فیض کے بغیر ترقی پسند شاعری کٹی ہوئی پتنگ رہ جاتی ہے اور اگر فیض ترقی پسند شاعر نہ ہوتے تو وہ اس تحریک کے ناقدانِ فن کی "نگاہِ کرم" کی جگہ "نگاہِ گرم" کے شکار ہو جاتے۔ ان پر "رومانویت" کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا اور انھیں اختر شیرانی کے مقلدین کی فہرست میں شامل کر کے کبھی کہ فراموش بھی کر دیا گیا ہوتا۔ حقیقتاً وہ ترقی پسند تحریک ہی تھی جس نے فیض احمد فیض کو ایک بڑے شاعر کے منصب پر لا کھڑا کیا۔ اس لیے فیض کے فن پر قلم اٹھانے والوں کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک اور اس کے عوامل و محرکات کی روشنی میں فیض کا جائزہ لینے کی مخلصانہ کاوش کریں۔ ویسے بھی اردو میں ایک ہی تو شاعر ہوئے ہیں جو بچ بھی گئے نکل کا بھی گئے... رومان سے ہجرت کی حقیقت میں آگئے۔ حقیقت سے نجات پائی پھر رومان میں لوٹ آئے۔

۱۹۳۵ء کا سن ہماری تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ وہی سال ہے جس میں ایک طرف ہندوستانی سیاست میں بڑی تبدیلی آئی تو دوسری طرف اردو ادب میں بھی نمایاں تبدیلی کے آثار پیدا ہوئے۔ رسالہ "اردو" کی جولائی ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا ایک زبردست، دھچکا دینے والا مضمون شایع ہوا جس کا عنوان "ادب اور زندگی" تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے روایتی قسم کے تقلیدی ادب کے پرزے اڑائے تھے اور دلائل و براہین کے ذریعے اس بات کی طرف نوجوان ادیبوں اور شاعروں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ تخیل پرستی کی فضاؤں اور ماضی کے تجربوں سے باہر آکر دیکھیں اور نئی زندگی کے نئے مسائل کی طرف سے غافل نہ ہوں کیونکہ جب تک زندگی کے حقائق سے رابطہ قائم نہیں کیا جائے گا زندگی کی سچی ترجمانی اور تعبیر کی کاوش نہ کی جائے گی تب تک ہمارا ادب لائقِ اعتنا قرار نہیں پائے گا۔ اختر حسین رائے پوری کا یہ مضمون اس زمانے کے نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ بن گیا تھا۔ نہ صرف اردو میں بلکہ ہندی، گجراتی، پنجابی، بنگالی اور اڑیا، زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے تھے اور ان زبانوں کے قلم کار بھی اتنا ہی متاثر ہوئے تھے جتنے اردو زبان کے شاعر۔ یہاں میں اس بات کی وضاحت کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا کہ جب ترقی پسند تحریک کے قائدِ اعظم سید سجاد ظہیر عرف بنے بھائی پیرس کی کانفرنس میں شرکت کرنے اور وہاں مختلف لوگوں سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد ان کی نقل میں ہندوستان میں تحریک چلانے کی اسکیموں پر غور کر رہے تھے ٹھیک اسی وقت ہندوستان کے ایک اوریجنل ادیب ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ملکی حالات اور زندگی کے تجربات کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ ادب میں انقلابی تبدیلی لانا چاہیے۔ بنے بھائی جب اپنے رئیس دوستوں کے ساتھ لندن کے نانکنگ ریستوران میں بیٹھ کر ان سب کی مدد سے ترقی پسند تحریک کا مینی فیسٹو لکھنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس وقت تک اختر حسین رائے پوری اپنا زبردست ہنگامہ خیز مضمون "ادب اور انقلاب" لکھ بھی چکے تھے۔ اسی طرح اپریل ۱۹۳۶ء میں جب بنے بھائی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کی اس سے کچھ پہلے ہی اختر حسین رائے پوری بھارتیہ ساہتیہ پریشد ناگپور کے اجلاس میں ایک مینی فیسٹو پیش کر چکے تھے اور اس مینی فیسٹو پر بابائے اردو مولوی عبدالحق اور بابائے ہندی منشی پریم چند کے علاوہ پنڈت جواہر لال نہرو اور آچاریہ نریندر دیو نے بھی اپنے دستخط ثبت کیے تھے۔ یہاں اختر حسین رائے پوری کے مینی فیسٹو سے

ایک طویل اقتباس نقل کرنا بے محل نہ ہوگا کیونکہ قارئین اس کی روشنی میں خود فیصلہ کر سکیں گے کہ اس میں اور ترقی پسند تحریک کے مینی فیسٹو میں کتنی مماثلت ہے۔

"ہمارے دیش میں یہ پہلا موقع ہے کہ مختلف زبانوں کے ادیب باہمی تعاون کی غرض سے ایک جگہ جمع ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس تعاون کی بنیاد کیا ہو۔ کئی تجویزیں اس جلسے میں پیش ہوئی ہیں لیکن ایک اہم مسئلہ نظر انداز کر دیا گیا ہے جس پر سب سے پہلے غور کرنا چاہئے تھا۔ ہم نے یہ تو طے کر لیا کہ ادب کا قالب کیا ہوگا مگر یہ نہیں بتایا کہ اس کے قلب کا رنگ روپ کیا ہو۔ پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ کیا کہنا ہے اور کن سے کہنا ہے۔ کیسے کہنا ہے کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ادب کے مسائل کو زندگی کے دوسرے مسائل سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی مکمل اکائی ہے، اسے ادب، فلسفہ، سیاست وغیرہ کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ کاروانِ حیات کا رہبر ہے۔ اسے محض زندگی کی ہم رکابی ہی نہیں کرنا ہے بلکہ اس کی رہنمائی بھی کرنا ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری زندگی کدھر جا رہی ہے۔ اور اسے کدھر جانا ہے ——— ادیب انسان بھی ہے اور اسے سماج کی ترقی کے لیے اتنا تو کرنا ہی ہے جو ہر انسان کا فرض ہے۔ انسانیت کے نام پر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا آج جب ترقی دشمنی کی طاقتوں میں فیصلہ کن جنگ شروع ہو چکی ہے، ادب اپنے کو غیر جانب دار رکھ سکتا ہے۔ کیا حسن، آرٹ وغیرہ کی نقاب پہن کر وہ کارزارِ حیات سے راہِ فرار اختیار کر سکتا ہے؟ کیا واقعہ نگاری کی فصیل پر بیٹھ کر انقلاب و رجعت کی طاقتوں کی تصویر لے سکتا ہے؟

احساس ہر قسم کے آرٹ کی جان ہے تو پھر غریبوں اور مظلوموں کا حالِ زار ہمیں بے حس کیوں کر رکھ سکتا ہے؟ اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے چہرے سے بیکاری، افلاس اور

ظلم کے داغ دھو دئے جائیں تو حاشا یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہو، وہ کیا کہے، کن سے کہے اور کس طریقے سے کہے ـــــــ

چنانچہ ہندوستانی ادیبوں سے ہماری یہ توقع واجب اور جائز ہے کہ وہ یہ ثابت کر دکھائیں گے کہ ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں اور زندگی مسلسل تغیر و تبدل کی کہانی ہے۔ زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے، اسے عروج کی راہ دکھاتا ہے اور جملہ بنی نوع انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ملک کا ادب زندگی سے اپنے کو وابستہ کر دے اور زندگی کے ارتقا کا علمبردار ہوگا ـــــــ"

یہ تو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا تیار کردہ اعلامیہ تھا جو انھوں نے بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے ناگپور اجلاس میں بہ آواز بلند ہزاروں لوگوں کے سامنے پڑھا اور پیش کیا تھا۔ اب انجمن ترقی پسند مصنفین کا اعلامیہ بھی ملاحظہ فرمائیے جو لکھنؤ میں انجمن کی منعقدہ پہلی کل ہند کانفرنس میں پڑھا گیا تھا:

"ہمارے ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پستی اور رجعت پسندی کو اگرچہ موت کا پروانہ مل چکا ہے لیکن وہ ابھی تک بے بس اور معدوم نہیں ہوئی ہے۔ نت نئے روپ بدل کر یہ مہلک زہر ہمارے تمدن کے ہر شعبے میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ اس لیے ہندوستانی مصنفین کا فرض ہے کہ ملک میں جو نئے ترقی پذیر رجحانات ابھر رہے ہیں، ان کی ترجمانی کریں اور ان کی نشو و نما میں پورا حصہ لیں۔

ہندوستانی ادب کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ زندگی کی بیّن اور حقیقی کیفیتوں سے جی چرانا چاہتا ہے۔ حقیقت اور اصلیت سے بھاگ کر ہمارے ادب نے بے بنیاد روحانیت اور تصور پرستی کی آڑ میں پناہ لی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے عناصر اور قوی مضمحل ہو گئے ہیں۔ اس کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ ہمارے ادب میں عقلیت مشکل سے پائی جاتی ہے۔

ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جد و جہد کا ترجمان بنا کر روشن مستقبل کی راہ دکھائے۔ جس کے لیے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے۔

ہم ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین قدروں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس لیے زندگی کے جس شعبے میں رد عمل کے آثار پائیں گے انھیں افشا کریں گے۔ ہم انجمن کے ذریعے سے ہر ایسے جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب و تمدن سے فائدہ اٹھائیں گے، ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔

ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی، اور توہم پرستی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ہم ان تمام قوتوں کو جو ہماری قوت تنقیدی کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں تغیر اور ترقی کا ذریعہ قبول کرتے ہیں ۔۔۔۔۔

اختر حسین رائے پوری کے تیار کردہ اس اعلامیے میں اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ میں نے ایک غیر جانبدار ناقد کو یہ کہتے سنا ہے کہ سجّے بھائی نے اختر حسین رائے پوری والا منشور بڑی صفائی سے اڑا لیا تھا بالکل اسی طرح جیسے سیاسی پارٹیاں الکشن سے پہلے ایک دوسرے کے منشور اڑا لیا کرتی ہیں، بہرحال ترقی پسند تحریک کے نقارچیوں نے ترقی پسند تحریک کی پہلی لکھنؤ کانفرنس کا اور اس کے منشور کا بڑے زور و شور سے پروپیگنڈہ کیا اور اس زبردست پروپیگنڈے کے نقار خانے میں اختر حسین رائے پوری والا منشور طوطی کی آواز ثابت ہوا جسے بہت کم لوگوں نے سنا لیکن آج تقریباً نصف صدی بعد وہ وقت آگیا ہے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔

فیض نے جب اپنی پہلی نظم لکھی تھی وہ ۱۹۲۹ء کا سال تھا جب ان کی عمر بلوغیت کی حدوں کو پہنچ رہی تھی۔ یعنی وہ ۱۸ سال کے ہو چکے تھے۔ ایک خوش حال اور بے فکرے زمین دار گھرانے کا اٹھارہ سالہ لڑکوں جیسا لڑکا جس نے کبھی غریبی کا ذائقہ نہ چکھا ہو جس نے کبھی جسمانی مشقت نہ کی ہو، جس کو کبھی اقتصادی پریشانیوں

سے واسطہ نہ پڑا ہو۔ جس نے بھوک، پیاس اور ظلم نہ سہے ہوں ظاہر ہے کہ وہ جو نظم لکھے گا وہ حسن اور اس کی رعنائیوں کے ذکر سے سرشار ہوگی۔ کسی گل عذار محبوب کے تصور سے رنگین ہوگی۔ اس میں اختر شیرانی والی شاعری کی شیرینی ہوگی اسے انقلاب سے کیا نسبت ؟ فیض کی شاعری کی یہ رومانی لے اس وقت اور بھی زیادہ رومانی ہوگئی جب وہ ۱۹۳۵ء میں امرت سر کے ایک کالج میں انگریزی کے لکچرار ہوگئے۔ شرمیلی طبیعت والے یہ نوجوان لکچرار لڑکیوں میں خاصے مقبول ہونے لگے۔ کچھ اپنی خوبصورتی اور نوجوانی کی وجہ سے۔ کچھ اپنے شرمیلے ناز و انداز کی وجہ سے اور کچھ اپنی رومانی طبیعت اور شاعری کی وجہ سے۔ ابھی انھیں لکچرار بنے ہوئے ایک ہی سال گزرا تھا کہ الٰہ آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین قایم کرنے کے بعد بنّے بھائی انجمن کا کام ہندوستان گیر پیمانے پر پھیلانے کی غرض سے امرت سر اور لاہور کے دورے پر نکلے اور محمود الظفر اور رشید جہاں کے علاوہ فیض سے بھی ملے۔ کم عمر فیض نے جب بنّے بھائی کی زبانی پیرس کانفرنس کے حالات اور لندن میں ان کی اور ان کے دوستوں (ملک راج آنند، جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور محمد دین تاثیر وغیرہ) کی ادبی کارگزاریوں اور دلچسپیوں کے بارے میں باتیں سنیں تو وہ بہت متاثر ہوئے اور پھر جب سجاد ظہیر نے ان سے اس تنظیم کے قیام کی بابت ذکر کیا تو فیض احمد فیض بخوشی اس کام کے لیے آمادہ ہوگئے اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہوگئے۔ معترضین چاہے لاکھ الزام لگاتے رہیں کہ فیض کی شاعری ترقی پسند کم اور رومانی زیادہ ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک سے فیض کی وابستگی پر کوئی انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ تحریک سے فیض کی "وفاداری بشرط استواری" اصل ایماں رہی ہے اور وہ اس دل بدلی کے زمانے میں بھی اخیر دم تک اسی تحریک کے ساتھ رہے اور نباہ کی۔ حالانکہ ان کے مارکسسٹ ہونے کا پول اس وقت کھل گیا تھا جب ان کی شادی ہوئی۔ بہو کا نام تک بدل ڈالا۔ خیر محبت اور ملازمت میں تو اس قسم کے لطیفے آئے دن ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کہیں عورت کو اپنا نام اور مذہب بدلنا پڑتا ہے اور کہیں مرد کو امام صاحب کے پاس جاکر تبدیلی مذہب کا سرٹیفیکیٹ لینا پڑتا ہے لیکن ان باتوں سے کسی کی ترقی پسندی یا جدیدیت خطرے میں نہیں پڑتی بلکہ ایڈیٹر لوگ بھی اس قسم کے سرٹیفیکیٹ شایع کرکے اپنی حق گوئی و بے باکی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں اور ہتک عزت کے دعوؤں کا سامنا بھی ہنستے کھیلتے کرلیتے ہیں کیونکہ انھیں بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ان تلوں میں سے تیل نکل چکا ہے، اور بھوسی بالآخر بھوسی ہی تو ہے۔ ادب میں درجنوں ایسے شیر پھر سے چوہے بنے ہیں۔

الٰہ آباد کانفرنس کے بعد جب دہلی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں فیض احمد فیض نے بھی شرکت کی۔ اس کانفرنس میں اسپین کے جمہوریت پسند عوام کی زبردست حمایت کی گئی تھی اور ان کی مدد کے لیے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی۔ لیکن بنّے بھائی اور دیگر ترقی پسند بشمول فیض احمد فیض اس سلسلے میں عملی طور پر کچھ بھی نہ کرسکے۔ اور زبانی ہمدردیوں سے اسپین والوں کو جو فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ ظاہر ہے کیا ہوسکتا ہے۔

دسمبر ۱۹۳۸ء میں جب کلکتہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس منعقد کی گئی تو اندر

نا تھ ٹیگور تو اپنی علالت کی وجہ سے اس میں شرکت نہیں کر سکے لیکن فیض کے اس میں شریک ہونے کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ ہو سکتا ہے اتنے لمبے سفر کی صعوبت کے خیال سے نہ جا سکے ہوں ویسے اسی سال وہ ماہنامہ "ادبِ لطیف" کے مدیر بن چکے تھے اور ایک شاعر و مدیر کی حیثیت سے ان کی شہرت بھی ہونے لگی تھی۔ "ادبِ لطیف" کے علاوہ ایک اور بے قاعدہ مجلّہ "نیا ادب" ترقی پسند تحریک ہی کا ترجمان تھا۔ اس رسالے میں فیض کا جو مضمون شایع ہوا اُس کا عنوان ہے۔ "انیسویں صدی میں اُردو ادب کا سماجی پس منظر" لیکن اتنے لمبے عنوان کے باوجود اس کا اندرس پھیلا ہوا ہے۔ جو صرف اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ فیض صاحب شاعرانہ ذہن رکھتے ہیں لیکن ان میں تنقیدی بصیرت بس برائے نام ہی ہے۔

مئی ۱۹۴۲ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تیسری کُل ہند کانفرنس دہلی میں منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں سکہ بند ترقی پسندوں کے علاوہ حلقۂ اربابِ ذوق کے شعرا و ادبا نے بھی شرکت کی تھی جن میں میراجی، ن۔ م۔ راشد، قیوم نظر، عبدالمجید سالک اور مولانا صلاحُ الدین وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ فیض اس کانفرنس میں بھی شریک نہیں ہوئے۔ پتہ نہیں اسرارالحق مجاز کے اس قول میں کہاں تک صداقت ہے کہ : —— فیض کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ بیگم نے منع کر دیا ہوگا کہ مت جاؤ چنانچہ وہ نہیں آیا ——"

۱۹۴۲ء ہی میں ملک گیر پیمانے پر " ہندوستان چھوڑ دو " تحریک چلائی گئی۔ ملک کے تمام اہم لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ پورے ملک میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایک کہرام مچ گیا۔ سرفروشانِ وطن اپنے سروں پر کفن باندھ کر میدان میں آ گئے۔ ٹھیک اُن ہی دنوں فیض احمد فیض کا اوّلین مجموعۂ کلام "نقشِ فریادی" شایع ہوا۔ جس میں شروع سے آخر تک رُومان ہی رُومان ہے، عشق ہی عشق ہے۔ رنگینی ہی رنگینی اور سرشاری ہی سرشاری ہے۔ اگر کچھ نہیں ہے تو اپنے عہد کی رُوح، اپنے گرد و پیش کی زندگی کی ترجمانی، اپنے دور کے حالات و واقعات اور مسائل و موضوعات۔ "نقشِ فریادی" کے دیباچے میں فیض بقلم خود لکھتے ہیں :

"اس مجموعے کی اشاعت ایک طرح کا اعترافِ شکست ہے،
شاید اس میں دو چار نظمیں قابلِ برداشت ہوں "

ظاہر ہے یہ اعتراف ان کی صاف گوئی پر محمول کیا جائے گا۔ اس کے کچھ عرصے بعد فیض احمد فیض نے "سویرا" (لاہور) کے شمارہ نمبر ۱۲ میں "شاعری کی قدریں" عنوان سے ایک مضمون شایع کرایا جس میں اُن کے اپنے نظریۂ فن کی وضاحت ہوتی ہے۔ فیض لکھتے ہیں :

"اگر کسی شاعر کا کلام جمالیاتی تاثر کے اعتبار سے ناقص رہے تو

یہ اس کی افادیت پر بھی اثر انداز ہوگا۔ ایسا کلام نہ صرف فنی یا جمالیاتی اعتبار سے حقیر ہوگا بلکہ اس کی افادیت بھی مشکوک ہوگی اور اس کے یہ بھی معنی نہیں کہ محض مزدور، کسان، امن یا ایسا ہی کوئی دوسرا عنوان یا موضوع دوسری خوبیوں کی غیر موجودگی میں کسی تحریر کی ترقی پسندی کا واحد ضامن نہیں ہو سکتا۔"

بظاہر اس اقتباس کا مخاطب اردو ادب کا عام قاری ہے لیکن درحقیقت اس کے صحیح مخاطب سردار جعفری ہیں جن پر فیض احمد فیض نے بڑی نفاست اور ادب سے وار کیا ہے یہ سمجھیے کہ پھینکا ہے اس نے سنگ گلوں میں لپیٹ کے۔ لیکن سردار جعفری کی شمشیر برہنہ سے بچنا بھی آسان کام نہیں (حالانکہ آجکل ان کی شمشیر زنگ آلودہ ہے) ملاحظہ ہو:

سردار جعفری "ترقی پسند ادب" میں واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

"ترقی پسند مصنفین نے ادب کے اس تاریخی، مادی اور عوامی تصور کو اپنایا ہے جس کے نزدیک ادب نہ تو چند پیٹ بھروں کی میراث ہے۔ نہ ذہنی عیاشی کا سامان۔ وہ ادب کو عوام کی ملکیت قرار دیتے ہیں اور اس پر زندگی کے سنوارنے اور سنوارنے کا مقدس فرض عاید کرتے ہیں اور جدوجہد حیات میں اسے ایک حربے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔"

سردار جعفری کے نزدیک ترقی پسند شاعر کا خود بھی مجاہد ہونا ضروری ہے چاہے اس کے ہاتھ میں تلوار تو کیا سوئی بھی نہ ہو کیونکہ 'مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی'۔ سردار جعفری قلم کاروں اور محنت کشوں کے اتحاد کے حامی ہیں۔ ان کے خیال میں اس اتحاد کے فقدان کے باعث قلم کاروں کی ہر تخلیق نہ صرف ادھوری۔۔۔ بلکہ وہ بھونڈی اور بھونڈی بھی ہوگی۔

"اس لیے ادیبوں اور مزدوروں کا اتحاد تخلیقی اتحاد ہے۔ مزدوروں کے ساتھ اتحاد کا نعرہ نیا نہیں ہے۔ ترقی پسند تحریک نے اس نعرے کے ساتھ جنم لیا ہے۔ حالانکہ ہمارے اعلان نامے میں

مزدور کا نہیں عوام کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن یہ ہر شخص جانتا ہے کہ مزدور عوام کا سب سے اہم، باعمل اور انقلابی حصہ ہیں۔"
(ترقی پسند ادب صفحہ ۵۸-۵۹۔)

سردار جعفری کی ان باتوں نے وامق جونپوری کے کان کھڑے کر دیے اور انھوں نے اس کا نتیجہ یہ نکالا کہ اصلی ترقی پسند شاعری وہی مانی جائے گی جو عوام سمجھ سکیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب تخلیق کار عوام کی زبان کا استعمال کریں۔ اُردو کے بیشتر ترقی پسند ادیب متوسط اور اعلیٰ طبقوں کی پیداوار ہیں اس لیے وہ نہ تو عوام کی زندگی سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور نہ ان کی زبان سے۔ وامق جونپوری نے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے مضمون بعنوان "عوامی شاعری" میں ترقی پسند تحریک کا تو ماہی اُڑا دیا:

"اگر سختی کے ساتھ ترقی پسند ادب کا جائزہ لیا جائے تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ۱۹۳۶ء سے لے کر آج تک اُردو میں صرف تین یا چار ایسی عوامی نظمیں لکھی گئی ہیں جن کو قبولِ عام کی سند حاصل ہے۔ مثلاً مخدوم کی نظم "جنگِ آزادی"، "میرا گیت"، "بھوکا ہے بنگال" اور عمر شیخ کا "نیا ترانہ"۔ عوامی تحریک کے سلسلے میں ان تین مخصوص نظموں نے جادو کا کام کیا ہے۔"

"اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" کے مصنف خلیل الرحمن اعظمی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ وامق جونپوری کے اس بیان کو پڑھ کر:——

"سردار جعفری کو اپنے پیروں کے نیچے سے زمین نکلتی نظر آئی اس لیے کہ عوامی شاعری کو ہی معیار بنا کر جعفری نے فیض کو ترقی پسندی سے خارج کرنے کی کوشش کی تھی لیکن عوامی شاعری کے لیے عوام کی بولی ٹھولی ایک لازمی شرط قرار پائی تو پھر جعفری کی شاعری متوسط طبقے کی روایتی شاعری ٹھہری جس کی ترقی پسندی مشکوک ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۴۳ء، ۱۹۴۴ء میں جب بنگال زبردست اور بدترین قحط سے دوچار تھا:

اس وقت ترقی پسندوں نے اسے موضوع بنا کر خوب افسانے اور نظمیں لکھیں۔ وامق جونپوری کا گیت "بھوکا ہے بنگال" ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گونج اُٹھا۔ سید مطلبی فرید آبادی کا گیت:

تیرے ہی بچے تیرے ہی پالے
دھرتی ماں چھاتی سے لگالے

بھی اُسی دور کی یادگار ہے۔ اخترالایمان کی نظم "ایک سوال" اور اختر انصاری دہلوی کی نظم "کلکتہ" کے علاوہ اس موضوع پر سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کی نظمیں بھی مل جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ جگر مرادآبادی جیسا شاعر بھی رندی اور سرمستی کے باوجود سسک اُٹھتا ہے اور کہتا ہے:

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں

کئی اور رومانی شاعروں نے بھی تھوڑے عرصہ کے لیے ساقی کو چھٹی دے دی تھی۔
لیکن اس خوفناک قحط سے جس کی مثال برصغیر کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اگر کوئی شخص متاثر نہیں ہوا تو وہ ہے ترقی پسند تحریک کا سب سے بڑا نمائندہ اور پسندیدہ فنکار فیض احمد فیض ——
ہندوستان کی تحریک آزادی میں ترقی پسند تحریک کا جیسا بھی اور جو بھی رول رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن آزادی حاصل ہوجانے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے اشارے پر سارے ترقی پسند آزادی ہی کے خلاف ہوگئے اور آزادی کے خلاف اعلانیہ اپنا ردِعمل بھی پیش کرنے لگے کہ یہ وہ آزادی نہیں ہے جو ہم چاہتے تھے اور جس کے لیے ہم نے جدوجہد کی تھی۔ شاید ترقی پسندوں کا یہ خیال ہو کہ ہندوستانی لیڈروں کے پاس کوئی الہ دین کا چراغ یا حاتم طائی کی انگوٹھی ہاتھ آگئی ہے جس کے گھستے ہی کوئی جن ہاتھ باندھے حاضرِ خدمت ہوگا کہ کیا حکم ہے میرے آقا۔ اور آقا اسے حکم دیں گے کہ ہندوستان کے سارے مسائل حل کردو اور ہندوستانیوں کے تمام دکھ درد دور کردو یہ سن کر جن چشمِ زدن میں سب کچھ کرڈالے گا —— انگریز حکمرانوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ہمارے ملک میں کتنے مسائل اُٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی نوعیت کیا تھی یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ آزادی اور تقسیم کے اس پرآشوب دور کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجائے کچھ سوچے سمجھے بغیر ایسا ردِعمل پیش کرنا تو بہرصورت نادانی ہی کا عمل قرار پائے گا۔ فیض کی مشہور نظم "صبحِ آزادی" (۱۵ اگست ۱۹۴۷ء) بھی اسی عمل کا ایک کھلا ثبوت ہے۔

ملاحظہ ہو:

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

انجمن ترقی پسند مصنفین کی پانچویں کل ہند کانفرنس ۱۹۴۹ء میں بھیمڑی میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں ایک نیا اعلان نامہ منظور کیا گیا جس میں ملک اور بیرون ملک کی سیاست میں ترقی پسندوں کو عملی طور پر حصہ لینے اور ترقی پسند طاقتوں کی اعلانیہ حمایت کرنے پر زور دیا تھا۔ اس میں بہت سی ایسی باتیں بھی آگئی تھیں جو ترقی پسند تحریک کے لیے مضر ثابت ہوئیں۔ جب بھیمڑی کانفرنس کا منشور شایع ہوا تو اس سے بے اطمینانی کا اظہار سب سے پہلے سردار جعفری نے کیا اور طویلے کی بلا بندر کے سر کے مصداق انھوں نے نئے منشور کا غصہ فیض پر اُتارا۔ "شاہراہ" میں اپنے ایک مضمون "ترقی پسندی کے بعض بنیادی مسائل" میں وہ لکھتے ہیں:

"فیض نے اپنی پندرہ اگست کی نظم میں استعاروں کے کچھ ایسے پردے ڈال دیے ہیں جن کے پیچھے پتہ نہیں چلتا کہ کون بیٹھا ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے:

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اور آخری مصرعہ ہے:

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

لیکن یہی بات تو مسلم لیگی لیڈر بھی کہہ سکتے ہیں کہ "وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں" کیونکہ انھوں نے پاکستان کے لیے چھ صوبوں کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن انھیں ملے مغربی پاکستان میں ساڑھے تین صوبے اور مشرقی پاکستان میں پون صوبہ۔ پھر کیوں نہ ترقی پسند عوام کے بجائے مسلم لیگ کے نیشنل گارڈ اسے اپنا قومی ترانہ بنالیں اور ڈاکٹر ساورکر اور گوڈسے بھی یہی کہتے تھے کہ "وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں" کیونکہ اکھنڈ بھارت نہیں ملا جسے وہ بھارت ورش اور آریہ ورت بنانے والے تھے۔ پوری نظم میں اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا کہ سحر سے مراد عوامی آزادی کی سحر ہے اور منزل سے مراد عوامی انقلاب کی منزل۔ اس نظم میں داغ داغ اُجالا ہے، شب گزیدہ سحر ہے، حسینانِ نور کا دامن

ہے، فضا کا دشت ہے، تاروں کی آخری منزل ہے، نگارِ صبا ہے، چراغِ سرِ راہ ہے، پکارتی ہوئی باہیں اور بلاتے ہوئے بدن ہیں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن نہیں ہے تو عوامی انقلاب اور عوامی آزادی غلامی کا درد اور اس درد کا مداوا۔ ایسی نظم تو ایک غیر ترقی پسند شاعر بھی کہہ سکتا ہے۔"

کچھ بھی ہو سردار جعفری نے جو باتیں کہی ہیں وہ دل سے نکلی ہیں اور دل پر اثر کرتی ہیں۔ واقعی ایسی نظم تو ایک غیر ترقی پسند شاعر بھی کہہ سکتا ہے۔ اس عہد میں مختلف اخبارات و رسائل میں شایع ہونے والی نظموں میں ہمیں اس قسم کی بلکہ اس سے اچھی بھی کئی نظمیں بہ آسانی دستیاب ہو سکتی ہیں۔ سردار جعفری کے اس مضمون کے متعلق خلیل الرحمن اعظمی اپنی کتاب میں کچھ اور ہی بات لکھتے ہیں :

"اس مضمون میں سردار جعفری نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فیض اور جذبی کی طرح کے شاعر صحیح معنوں میں ترقی پسند نہیں ہیں بلکہ ترقی پسند شاعری کا اعلیٰ نمونہ ان کی (یعنی سردار جعفری) کیفی اعظمی اور جاں نثار اختر کی شاعری ہے۔"[1]

لیکن افسوس کہ فیض نے اس مضمون کا کوئی اثر قبول نہیں کیا اور اپنی اسی رومانی شاہراہ پر چلتے رہے جو انھیں شروع ہی سے عزیز تھی۔ جب راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں سجاد ظہیر اور فیض کو گرفتار کیا گیا تو قید زمانے کی چار دیواری میں بھی اُن کا رومانی ذہن "پتھر کی دیوار" جیسی نظمیں تخلیق نہ کر سکا کیونکہ اس پر رومانویت کا رنگ اتنا گہرا چڑھ گیا تھا کہ پھر کسی اور رنگ کا چڑھنا ہی محال تھا۔ جب بھائی نے جب [illegible] سے اپنی شریک حیات رضیہ کو خطوط لکھے تو ان کی فرمائش کی تعمیل میں فیض کی ایک نئی نظم بھی ارسال کر دی جو کہ انھوں نے قید خانے ہی میں لکھی تھی۔ اس پر خود فیض نے بیگم رضیہ سجاد ظہیر کو ایک خط لکھا :

"آپ کی فرمایش پر بنے نے میری نئی اور فضول سی نظم غالباً آپ کو بھیج دی ہے میں نے تو منع کیا تھا کہ مت بھیجنا ——— کہیں

---

[1] خلیل الرحمن اعظمی "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک"۔ صفحہ ۱۱۱

علی سردار جعفری کی نظر پڑ گئی تو مجھ پر تنزل پسندی کا فتویٰ لگا دیگا۔ یوں بھی لوگ کہیں گے جیل میں ہیں بیٹھ کر محض گل و بلبل کی سوجھ رہی ہے۔ حالانکہ لکھنے کو اور اتنی باتیں رکھی ہیں بہرصورت آپ باتیں بنا دیں ہمارا جیل میں اگر عاشقانہ شعر لکھنے کو دل چاہے گا تو ہم ضرور لکھیں گے۔"

فیض احمد فیض کا یہ خط ظاہر کرتا ہے کہ وہ گل و بلبل اور عاشقانہ اشعار لکھنے کا شیوہ کبھی ترک نہ کرپائے۔ چاہے وہ گھر ہو یا قید خانہ، گلشن ہو یا ویرانہ، پاکستان ہو یا ہندوستان یا پھر داغستان، ان کی روش یہی رہے گی۔

اگر ہم ترقی پسند تحریک کے سارے پیچ و خم نظر میں رکھ کر اس کے سارے منشوروں کا گہرا مطالعہ کریں اور اس کے بعد غیر جانب دارانہ طور پر فیض کی شاعری کا جائزہ لیں تو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ فیض سچے ترقی پسند شاعر نہیں ہیں بلکہ سچے ترقی پسند علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، ظہیر کاشمیری اور نیاز حیدر ہیں۔

مجھے یاد آرہا ہے کہ فیض احمد فیض کے پہلے مجموعۂ کلام "نقش فریادی" کا مقدمہ سپرد قلم کرتے ہوئے ن، م، راشد نے فیض کی بابت لکھا تھا کہ: ——" یہ ایک ایسے شاعر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے ——" آج ہم فیض کے آخری مجموعے کی بابت بھی یہی بات کہہ سکتے ہیں۔ ان کی شاعری کی عمر نصف صدی سے کچھ زیادہ ہی ہے لیکن یہ عمر انھوں نے رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑے ہو کر رومان کی جانب رُخ کر کے گزار دی۔

آل احمد سرور نے (جو کہ آج کل روئے زمین کی جنت نظیر وادی کشمیر میں اقبال چیئر پر بیٹھے ہیں) مجاز لکھنوی کے بارے میں لکھتے ہوئے اسے "رومانیت کا شہید" قرار دیا تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب وہ فیض احمد فیض کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ شہید اعظم ——؟

جہاں میں اہلِ رومان صورتِ محبوب جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

پنجاب نے کئی رنگیلے اور البیلے شاعر پیدا کیے ہیں لیکن فیض کے البیلے پن کا انداز سب سے زیادہ رومانی تھا:

شعر میرے ہیں سب عوام پسند
پر مجھے گفتگو خواص سے ہے!

میر کی زندگی سراپا ٹریجڈی تھی۔ فیض صاحب کی زندگی سراپا عیش۔ ان کا کہنا ہے کہ میر کی شاعری نے انھیں بہت متاثر کیا لیکن میر کی غریبی نے نہیں۔ میر روزگار کی خاطر زمینداروں شہزادوں اور بادشاہوں کے درباروں کے چکر کاٹتے رہے۔ فیض صاحب کو ہر شہزادہ، زمیندار اور بادشاہ "اون ہیرٹ" کرتا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آج کا ہر زمیندار ترقی پسند ہے۔ کئی زمیندار ادیب بن گئے ہیں۔ سنہ ۱۹۸۲ء کی ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس جے پور میں منعقد ہوئی جہاں ۵۵۰ ڈیلی گیٹوں نے شرکت کی۔ حالانکہ سنہ ۱۹۷۵ء والی گیا کانفرنس میں صرف ۱۱۰ اور سنہ ۱۹۸۰ء کی جبل پور کانفرنس میں ۳۳۰ ڈیلی گیٹ شریک تھے۔ اتر پردیش میں ساتویں کانفرنس ہوئی اور آندھرا پردیش میں آٹھ بار۔ آسام جیسے صوبے میں سیلاب کے باوجود تین کانفرنسیں ہو چکی ہیں اور بہار میں چھ۔ حتیٰ کہ قبائلی علاقے میں بھی تحریک گھس گئی اور نیتر میں اپریل سنہ ۱۹۸۲ء میں ہنگامہ ہوا۔

پہلی کانفرنس سنہ ۱۹۳۶ء کی صدارت پریم چند نے کی تھی۔ سنہ ۱۹۸۲ء کی کانفرنس کا سہرا ان کے لڑکے امرت رائے کے سر پر تھا۔ اب جب تمام شاہان وقت پر تحریک شامل ہو گئے ہیں تو تحریک اپنی جگہ پہنچ چکی ہے۔ ہر شاہ عوام کی بات کرتا ہے۔ قومی یک جہتی پر مشاعرے کرواتا ہے۔ امیر خسرو کی پہیلیاں اور دو سخنے سناتا ہے۔ پہلے پنگھٹ کی گوریاں آتی تھیں۔ آجکل میڈیا گرلز ان کی شیدائی ہیں۔ امیر خسرو بسنت کے تہوار پر اپنے خواجہ نظام الدین کو منانے کے لیے سرسوں کے پھول لائے تھے۔ آج اپنے شاہوں کو منانے کے لیے سنہری کاغذ کے پھول لاتے ہیں۔ امیر خسرو نے مور کو ہندوستان کا قومی پرندہ کہا تھا، فیض صاحب نے شاہین کو اپنایا۔ حالانکہ اقبال شاہین کو بقول ظ۔ انصاری اسلامی پرندہ کہہ چکے تھے۔ انگریز کے زمانے میں ہندو پانی مسلم پانی تو سنا تھا لیکن پرندے بیچارے کب مذہبی ہونے لگے۔ سائنس کہاں تک ترقی کر گئی ہے؟

OO

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

—— دستِ صبا

میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا؟

سیالکوٹ کی سرزمین نے ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ نمایاں رول ادا کیا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ساکلا قبیلے نے سکندرِ اعظم کی فوجوں کے چھکے چھڑائے تھے۔ جہاں محمود غزنوی نے کھوکھروں کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ جہاں کے بہادر سپاہیوں نے بابر کے پاؤں پنجاب میں نہیں جمنے دیے تھے۔ پورن بھگت اور رانی لونا کی داستان بھی سیالکوٹ کی ہے۔ گورونانک کی بیری بھی شہر سے زیادہ دور نہیں ہے اور ویر حقیقت رائے کی سمادھی بھی اسی شہر میں ہے۔ اسی شہر میں اردو کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال پیدا ہوئے اور اسی خاک نے ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء کو ایک اور شاعر کو جس کا نام ان کے والدین نے فیض احمد خاں رکھا لیکن جو بعد میں فیض احمد فیض کے نام سے مشہور ہوا، جنم دیا ——— ابتدائی تعلیم بھی اس سیالکوٹی منڈے نے اسی استاد سے پائی جنھوں نے اپنی جوانی میں علامہ اقبال کو پڑھایا تھا یعنی مولوی سید حسن ——— اسکول بھی وہی تھا جہاں اقبال اکثر دیر سے جایا کرتے تھے وہی اسکاچ مشن اسکول وہی کالج روڈ وہی مرے کالج، وہی ٹرنکوں والا بازار اور وہی اندرونی محلہ، وہی قلعہ، وہی کچہری، جہاں فیض کے والد وکالت کرتے تھے۔ ویسے تو اس خطے سے اور بھی ادیب اٹھے ہیں اور خاکسار نے بھی سیالکوٹ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ لیکن ایک کہاوت کے مطابق سیالکوٹ نے عاشق زیادہ اور معشوق کم پیدا کیے ہیں۔ سندھوں اور جوگیوں نے سیالکوٹ کو ایک نیا کردار بخشا تھا۔

فیض کے والد سلطان محمد خاں خلافت تحریک کے ساتھ جہلم سے افغانستان ہجرت کر گئے۔ جہلم میں وہ وکالت کرتے تھے۔ کابل پسند آگیا، وہیں بس گئے۔ تیرہ سال وہاں ملازمت کی۔ افغانستان کے امیر عبدالرحمٰن کی بھتیجی سائرہ جان سے شادی ہوئی۔ دو سال کے بعد سائرہ جان کا انتقال ہو گیا۔ سائرہ جان کے جہیز میں ایک منگلیہ تانا جان نامی، درجنوں لونڈیاں اور غلام دیے گئے۔ کابل کی سیاست انھیں راس نہ آئی اور جہلم واپس آگئے۔ جہلم سے وہ لندن گئے جہاں سے انھوں نے بار ایٹ لا کا امتحان پاس کیا۔ واپس جہلم آئے۔ لیکن کچھ دوستوں کے کہنے پر سیالکوٹ میں بس گئے۔ یہاں رشتہ داروں کے اصرار پر دوسری شادی کی۔ نارووال تحصیل میں جسٹر نام کے گاؤں کے زمیندار عدالت خاں کی بیٹی کے ساتھ۔ ان سے تین لڑکے اور ایک لڑکی طفیل، فیض، عنایت اور بی بی پیدا ہوئے۔ سیالکوٹ میں سلطان محمد خاں نے وکالت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ پہلی شادی سے ایک لڑکی ہوئی تھی جس کا نام شجاع تھا۔ پیار سے اسے بی بی گل کہتے تھے ۔ ۔ ۔ بی بی گل نے اسّی سال کی عمر میں ۱۹۸۱ء میں فیض کے بارے میں مندرجہ ذیل بیان دیا:

"فیض صاحب پیدا ہوئے تو بہت سرخ سفید اور موٹے تازے تھے۔ بچپن سے ہی بہت خاموش مزاج اور حلیم الطبع تھے۔ صاف ستھرے رہنے کا بہت شوق تھا۔ کہانیاں سننے کا بھی بہت شوق تھا۔ تانا جان انھیں کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ ایسی کہانیاں جو بادشاہوں کے زمانے کی، اور پشت در پشت سے چلی آرہی تھیں۔ ان میں بعض تو عجیب ہی ہوتی تھیں۔ ایک قصہ بلکہ واقعہ جو میں بچپن سے بہت اشتیاق سے سنتے تھے ــــ دو ڈاکوؤں کی بات تھا۔ دادو اور ساددا اپنے زمانے کے بڑے نامی ڈاکو تھے۔ بڑی لوٹ مار مچائی اور ظلم و ستم کیے تھے۔ امیر عبدالرحمٰن نے انھیں پکڑوا کر لوہے کے ایک پنجرے میں بند کرا دیا اور پنجرہ عبرت کے لیے ایک اونچی ویران پہاڑی پر رکھوا دیا۔ دونوں بھوک پیاس اور دہشت سے مر گئے۔ ان کا گوشت پوست گل سڑ گیا۔ اور ہڈیوں کا پنجر وہیں پڑا رہا۔"

مہ و سال آشنائی یعنی یادوں کا مجموعہ (۱۹۷۹ء) میں فیض لکھتے ہیں: کہ ان کی سب سے پرانی دھندلی یاد ۱۹۲۰-۱۹۱۸ء کی ہے، جب وہ پانچ سال کے تھے۔ باقی ان کی زبانی سنیے۔ سیالکوٹ کا اس سے بہتر سین کسی اور نے نہیں کھینچا: ـــ ـــ

"صحیح سنہ وسال کا اندازہ اس عمر میں کس کو تھا۔ پہلی عالمگیر لڑائی

ختم ہو چکی ہے۔ ایک جانب انگریز حکمران اور ان کے دیسی حاشیہ بردار جشن فتح منا رہے ہیں۔ سڑکوں پر رنگین جھنڈیاں لگائی جا رہی ہیں توپیں چھوٹ رہی ہیں۔ بینڈ باجے اور فوجی سوار گشت کر رہے ہیں۔ دوسری طرف قومی آزادی کی تحریک شروع ہو چکی ہے۔ آئے دن جلسے جلوس نعرے جو بولے سو نہال، ست سری اکال۔ نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، قومی نعرے بندے ماترم ——— "تو ڈی بچہ ہائے ہائے" ——— آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ بڑے بڑے لیڈر پھولوں سے لدی ہوئی گاڑیوں سے گزر رہے ہیں۔ یہ موتی لعل نہرو ہیں۔ یہ محمد علی اور شوکت علی ہیں ——— یہ ابو الکلام آزاد ہیں۔ یہ بابا کھڑک سنگھ ہیں۔ یہ ڈاکٹر کچلو ہیں۔ جگہ جگہ خوش آمدید کے لیے دروازے سجائے گئے ہیں اور کوچہ و بازار میں تماشائیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہیں۔ آج ترکوں کی کسی فتح کی خوشی میں شہر میں چراغاں ہو رہا ہے تو کل کسی لیڈر کی گرفتاری پر سارے شہر میں ہُو کا عالم ہے"۔

یہ دن روس کے انقلاب کے بھی تھے۔ جگہ جگہ افواہیں پھیل رہی ہیں کہ روس کی فوج ہندوستان کی سرحدوں پر آن پہنچی ہے اور ہندوستان کے کسانوں اور مزدوروں کو سرخ جھنڈے کے نیچے منظم کر کے انگریزوں کو ملک سے باہر نکال دے گی۔ منٹو نے اپنے افسانہ "نیا قانون" میں بھی کچھ ایسا ہی نقشہ کھینچا ہے جب منگو کوچوان کچھ وکیلوں کو کچہری سے گھر لے جا رہا ہوتا ہے۔ بھگت سنگھ نوجوان بھارت سبھا قائم کر چکا تھا اور لالہ لاجپت رائے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کرنے لاہور ریلوے اسٹیشن سے جلوس نکالتے ہوئے انگریز افسروں کی لاٹھیاں کھا چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی مائیں اپنے بچوں کو ویر حقیقت رائے اور رانا پرتاپ بننے کو کہا کرتی تھیں۔

آگے چل کر فیض لکھتے ہیں:

"جب ابا کچہری چلے جاتے تو گلی محلے کے لوگ بانگ جو ہمارے

گھر کے آس پاس دُکان یا کاروبار کرتے اس گھر کے بیرونی چبوترے پر آ جمع ہوتے جہاں ابّا کے موکلوں کے لیے بنچ اور مونڈھے وغیرہ پڑے رہتے تھے کوئی گاہک آگیا تو جلدی سے اُدھر نپٹا کے پھر آ بیٹھتے۔ اللہ دتا پہلوان، چراغ دین تیلی، اللہ رکھا قصاب، خوشیا حجام اور ان کے یار دوست گھنٹوں ملکی اور غیر ملکی سیاست پر گپ لڑاتے رہتے" اور بھی کچھ سماعی ہے، میاں تما گاندھی اور محمد علی شوکت علی نے مل کر اعلان کر دیا ہے کہ ——— "ایک سال کے اندر اندر سب انگریز لاٹ کمشنر ڈپٹی کمشنر نکال دیے جائیں گے اور ان کی جگہ ہمارے لوگ لائے جائیں گے" اور یہ بھی سنا ہے کہ غازی کمال پاشا کی فوجیں انگریزوں کو ہرا کر افغانستان کی طرف سے آرہی ہیں: ہاں ہاں روسی فوجیں بھی تو ان کے ساتھ مل گئی ہیں۔ روس کے بادشاہ زار کا تختہ تو الٹ گیا۔ رہنا! وہاں کوئی لیڈر بنا ہوا ہے۔ لینن، اس نے مزدوروں کی فوج بنائی ہے اور بادشاہ کو بھگا کر سب روپیہ پیسہ لوگوں میں بانٹ دیا ہے۔ اور مزدوروں کا راج بھی بنا دیا ہے۔ شاباش شیر دے پتر، یار اپنے آغا صفدر سے کہو کہ وہ بھی کوئی ترکیب لڑائیں کچھ ہمارا بھی بھلا ہو (آغا صفدر شہر کے سیاسی لیڈر رہتے) کوئی ایسی ترکیب لڑ جائے تو مزہ آجائے یہ سامنے والے ساہوکار لالہ ہرجس رائے کا مال بٹے تو ہم سب کے وارے نیارے ہو جائیں"

اس طرح فیض نے بچپن سے ہی ایسا خواب دیکھنا شروع کیا جہاں تاج اُچھالے جائیں گے اور تخت گرائے جائیں گے:

سہ ماہی رسالہ 'غالب' کے فیض نمبر میں جو اپریل، جون ۱۹۷۶ء میں کراچی سے شایع ہوا ——— فیض لکھتے ہیں:

"ہماری چھٹی ساتویں جماعت کی طالب علمی میں جن کتابوں کا رواج تھا، وہ آج کل قریب قریب مفقود ہو چکی ہیں جیسے طلسم ہوش رُبا، فسانۂ آزاد، عبدالحلیم شرر کے ناول وغیرہ۔ یہ سب کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس کے بعد شاعروں کا کلام پڑھا۔ میر کا کلام پڑھا۔ غالب تو اس وقت بہت

زیادہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسروں کا کلام بھی آدھا سمجھ میں آتا تھا لیکن اُن کا دل پہ اثر کچھ اِس قسم کا ہوتا تھا جیسے سانس رُکنے لگی ہے۔ اِس مطالعے کی وجہ سے ایک خاص قسم کا لگاؤ شعر سے پیدا ہوا اور ادب میں دلچسپی ہونے لگی۔

پھر کرائے کے ناول پڑھنے شروع کیے۔ لیکن منشی نے فیض کے والد سے شکایت کی۔ والد صاحب نے حکم دیا کہ ــــــ اگر ناول بھی پڑھنا ہے تو انگریزی ناول پڑھو۔ اردو ناول اچھے نہیں ہوتے۔ شہر کے قلعے میں جو لائبریری ہے وہاں سے ناول لا کر پڑھا کرو۔"

چنانچہ فیض نے انگریزی ناول پڑھ ڈالے۔ ڈکنس، تھیکرے، ہارڈی، فرانس کے انقلاب کے بارے میں کارلائل کی کتابیں۔ دسویں جماعت میں ہی شعر لکھنے شروع کر دیے اور سیالکوٹ کے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے چلے گئے۔ لیکن منشی سراج الدین نے ڈانٹ دیا کہ ابھی شعر کہنے کا وقت نہیں ہے۔

فیض نے دُنیا دیکھی لیکن سیالکوٹ کو وہ دل سے نہ نکال سکے۔ " ویو پوائنٹ" میں خالد حسن (پاکستان فارن سروس فیم) لکھتے ہیں:

" یہ شہر فیض صاحب کی رگ و پے میں بسا ہوا ہے یہیں وہ پلے بڑھے اسکول اور کالج گئے۔ اُن کے والد انھیں مولوی میر حسن اور مولوی محمد ابراھیم سیالکوٹی کی خدمت میں لے گئے۔ انھوں نے پہلے مولوی میر حسن کے مکتب میں اور اس کے بعد میرے کالج میں عربی پڑھی۔ مولوی ابراھیم سے قرآن حدیث اور فقہ کا درس لیا۔ لندن میں مجھے بتایا کہ مولوی ابراھیم اس وقت ہندوستان کے جدید ترین علماء میں سے ہیں۔ فیض صاحب نے بچپن میں قرآن شریف حفظ کرنا شروع کیا اور تقریباً نصف حصہ حفظ کر لیا۔ اب بھی وہ ہمارے آدھے سے زیادہ مُلّاؤں سے بہتر علم کلام مجید کا رکھتے ہیں اور اس کے حوالے دیتے رہتے ہیں۔ چند سال قبل وہ سیالکوٹ واپس جانا چاہتے تھے۔ اس شہر کی اندھیری پیچ دار گلیوں کے لیے شدید نوسٹلجیا ہے۔ اہلِ سیالکوٹ اب بھی ان کو اپنا مانتے ہیں۔ فیض کے لڑکپن کے ایک

چچیرے دوست خواجہ فیروز الدین فیض کا چند سال قبل انتقال ہوگیا خواجہ صاحب مرحوم نے فیض کا نام تک اپنے نام میں شامل کرلیا تھا۔ ویسے سیالکوٹ میں وہ اپنے انگریزی نما انداز اور گورے چٹے رنگ کی وجہ سے فیروز کامی کہلاتے تھے۔ لندن میں ایک بار فیض نے مجھے بتایا کہ کالج میں اُن کا ایک مضمون الساعۃ کا سمجھا گیا کہ اسے نوٹس بورڈ پر لگا دیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک اور مضمون علمیت سے بھرپور رقم کیا لیکن اسے بہت کم نمبر ملے۔ ان کے انگریز اُستاد نے کہا۔ "پہلا مضمون جو تم نے لکھا وہ اوریجنل تھا۔ اِس مرتبہ تم نے دُوسروں کے خیالات دُہرائے۔ ایسا نہ کرو۔ تم اوریجنل خیالات اور ذہن کے مالک ہو۔ دُوسروں کی تقلید نہ کرو۔"

اور پھر جب فیض نے شعر کہنے شروع کیے تو کوئی اَدبی تاج خود بخود اُچھل گئے۔ کئی ادبی تخت اپنے آپ گر گئے۔ اُردو ادب میں وہ ایک آندھی کی طرح آئے لیکن بگولے کی طرح واپس نہیں گئے۔ انگریزی اور عربی میں ایم اے کرنے کے باوجود وہ اُردو کے ہی رہے۔ اُردو زبان کا چسکا ہی کچھ ایسا ہے اور خاص اگر پنجابی کو لگ جائے تو پھر چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ فیض نے اپنے بچپن کے بارے میں بہت کم لکھا ہے۔ روس سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔ لیکن لکھتے ہیں:

"روس لینن اور انقلاب کی بات اُن بھولے بسرے دنوں میں پہلی بار کان میں پڑی تھی اور اب کچھ اندازہ نہیں کہ ہمارے طفلانہ ذہن نے ان کے بارے میں کیا تصور باندھا ہوگا۔ پھر ہم ذرا بڑے ہو کر اسکول میں پڑھنے لکھنے اور دُوسری دلچسپیوں میں کھو گئے اور یہ سب کچھ بھول بھال گئے"——

فیض صاحب کن دُوسری دلچسپیوں میں کھو گئے اس کے بارے میں ان کی اپنی تحریر تو کوئی ہے نہیں لیکن یاروں دوستوں کے بیانات کے مطابق ان کی اوائلِ عمری اُداسیوں اور رنگینیوں کی ایک حسین آمیزش تھی۔ "دستِ تہِ سنگ" (۱۹۶۵ء) کے دیباچے میں فیض صاحب نے خود لکھا ہے کہ:

"۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور سے

کچھ عجیب طرح کی بے فکری، آسودگی اور دلولہ انگیزی کا زمانہ تھا جس میں اہم قومی سیاسی تحریکوں کے ساتھ نثر و نظم میں بیشتر سنجیدہ فکر و مشاہدے کے بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سا انداز رہتا۔"

فیض صاحب کی رنگ رلیوں کی تفصیل ان کے شعروں سے نہیں ملتی۔ ایک اندازہ سا تو ہوتا ہے لیکن آج کا دور اندازے کا دور نہیں ہے۔ ویسے بھی فیض صاحب ایک ایسے کامیاب پرفامنگ آرٹسٹ تھے جن کی زندگی پردے کے پیچھے بھی اتنی ہی رنگین تھی جتنی پردے کے آگے :

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

شیر محمد حمید جو فیض کے ساتھ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے اور ایک ہی ہوسٹل میں رہتے تھے اور جو بعد میں انھیں کے ساتھ راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے فیض کی ابتدائی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

"فیض نے ایک کھاتے پیتے معزز اور خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی۔ بچپن ناز و نعمت میں گزرا۔ آرام و آسائش کا کوئی لازمہ ایسا نہ تھا جو مہیا نہ ہو۔ نوکر چاکر خدمت کو موجود۔ شفیق ماں باپ کا دست محبت سر پر۔ بھائی بہنوں کا پیار میسر۔ یہ وہ ماحول تھا جس میں فیض پڑھا لکھا اور جوان ہوا۔ اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی ضرورت ہی نہ پیش آئی۔ کسی خواہش کے رد ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعت میں ایک طرح کا ناز ایک خود پسندی اور ایک احساس فخر و فتحمندی پیدا ہو گیا۔ تن آسانی اور سہل انگاری کی خو مزاج کا جزو بن گئی۔ گورنمنٹ کالج میں آئے تو کاہلی، تن آسانی کی عادت اور بے نیازی کی ادا بدستور موجود تھی۔ اپنی ضروریات سے بے نیازی اپنی چیزیں اور اپنے کپڑے تک سنبھال کر رکھنے سے لاپرواہی ——— ان کا کمرہ کباڑ خانے کا نقشہ پیش کرتا۔ لباس کبھی ڈھنگ سے نہ پہنتے۔ قیمتی سوٹ سلوٹوں سے بھرپور۔ جوتے پالش سے بے بہرہ۔ مہینوں حجامت نہیں بنی اور کئی کئی دن بغیر شیو کے

کم اردے"

یہ تھا نقشہ مستقبل کے شاعرِ سحر کا۔ شاعرِ تنہائی کا۔ شاعرِ انتظار کا۔ شاعرِ سویرا کا۔ ویسے بھی ان دنوں بڑھی ہوئی داڑھی انقلاب کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ انقلاب دبے پاؤں آئے یا اچھلتا کودتا، آخر ہے تو انقلاب۔ اردو کا قاری بھی بڑا ستم ظریف ہے۔ اچھے بھلے پیار محبت کے شاعر کو جوش ملیح آبادی بنا دیا۔ جنھوں نے ایک سینما گھر کی خاطر ایک ریڈی میڈ انقلاب ملتوی کر دیا تھا۔
اب ایک لطیفہ سنیے فیض صاحب کی زبانی:

"ایک مرتبہ ہم دہلی آئی، سی، ایس کا امتحان دینے گئے۔ پرچے عمدہ ہو رہے تھے۔ آخری پرچہ دینے نہیں گئے۔ کیوں نہیں گئے؟ بھئی یہ کسے معلوم۔ بس ایک بڑا سرکاری افسر بنتے بنتے بال بال بچ گئے۔ قریب بیٹھی ہوئی ایلس بولی: ضرور اس کے پیچھے کوئی لڑکی ہوگی۔"

فیض کی بیوی ولایتی ہے۔ اگر دیسی ہوتی تو واری نیاری ہو جاتی، گھی کے چراغ جلاتی اور کہتی "اگر آپ آئی سی ایس ہو جاتے تو پھر مجھ نگوڑی سے شادی تھوڑا ہی کرتے۔"
بی بی گل نے اس موضوع پر کچھ اور طرح سے روشنی ڈالی ہے:

"ہمارے والد بھی انگریزوں سے متاثر تھے لیکن اولاد پر الٹا اثر پڑا۔ فیض اپنے والد کے کہنے پر آئی سی ایس کے امتحان کی تیاری کرنے لگے۔ امتحان سے پہلے انھیں ہیضہ ہو گیا۔ اس لیے امتحان نہ دے سکے۔ پھر خیالات میں تبدیلی واقع ہوئی اور انگریزوں کے اتنے خلاف ہو گئے کہ آئی سی ایس کا امتحان ہی نہ دیا۔ خورشید انور آئی سی ایس میں اول آئے مگر بم بنانے کی وجہ سے انھیں ملازمت نہیں ملی۔ بلکہ سزا ہوئی۔ فیض کے باقی دوست سرکاری ملازمت میں شامل رہے۔"

سرکاری ملازمت تو فیض نے بھی کی۔ انگریز کی فوجی نوکری۔ لیفٹیننٹ کرنل کا عہدہ پایا۔ انگریز کی پلٹی کی۔ برطانوی وردی پہنی۔ میڈل مارے۔ پردہ نشینیں لیں۔ بقول اقبال عمر:

لندن میں جا کے کوئی فرنگی سے پوچھ لے
دِلّی کے بادشاہ کے ہم خیر خواہ ہیں

حقیقت تو یہ ہے کہ اس لال پرچم کے شاعر کو کالج کی لڑکیوں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بہت پسند تھا۔ فیض صاحب کو جب بھی لڑکیوں کے کالج میں مشاعرے پر بُلایا گیا ان کی یہ شرط تھی کہ کھانا نازنینوں کے ہاتھوں سے بنے گا۔ ویسے انھیں افغانی پلاؤ، شب دیگ اور حبشی کھانے بے حد پسند تھے۔ وہسکیوں میں جانی واکر اور بیر گولڈن ایگل ۔ — کالج کے زمانے میں گھومنے پھرنے اور گراموفون ریکارڈ سننے کا بہت شوق تھا۔ بی بی گل بتاتی ہیں کہ فیض کالج کی چھٹیوں میں ان کے پاس دھرم سالہ جو ہماچل پردیش میں ایک نہایت خوبصورت پہاڑی مقام ہے، آیا کرتے تھے :

”فیض اُن دنوں مرے کالج سیالکوٹ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ چھٹیاں ہوتیں تو ہمارے پاس آجاتے۔ ان کی بہنوئی انھیں بہت چاہتے تھے اور ان کے آنے سے بہت خوش ہوتے تھے۔ فیض کے ساتھ ان کے دو ایک دوست بھی آتے تھے جیسے خواجہ خورشید انور، خواجہ مسعود اور ایس۔ ایم۔ دین پیر فیض کا زیادہ وقت سیر و تفریح اور گھومنے پھرنے میں صرف ہوتا۔ جب یہ دوست اکٹھے ہوتے تو گراموفون ریکارڈ بجائے جاتے۔ خورشید انور کو جو ریکارڈ ناپسند ہوتا وہ اُسے توڑ ڈالتے۔ کچھ گانے سبھی کو پسند تھے اور وہی سُنا کرتے تھے۔ جیسے ”جمنا کے تیر“، ”لاگی کرجوا میں چوٹ“ یا بسنت راگ۔ جب سُننے سُنانے کو جی چاہتا تو سب لڑکے مل کر ایک گانا گاتے ——— ”میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا۔“

سُنا ہے کہ پاکستان کی حکومت نے سارے مُلک کے لوک گیت جمع کر لیے ہیں۔ اُمید ہے فیض کی بھینس والا لوک گیت بھی اس میں شامل ہوگا۔ ویسے ایک ہندوستانی فلمی شاعر نے یہی گیت ایک فلم میں پیش کر کے اسے ”ہٹ سانگ“ کا درجہ دے دیا ہے۔

فیض احمد فیض

اور کچھ دیر میں، جب پھر مرے تنہا دل کو
فکر آ لے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں، لیے سرخ چراغ
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے

——— زنداں نامہ

باب : چار

خیر ہو تیری لیلاؤں کی

فیض احمد فیض ٹھیٹھ قسم کے پنجابی تھے عین اسی طرح جس طرح علامہ اقبال تھے۔ دونوں کی مادری زبان پنجابی تھی اور دونوں کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ پنجاب کی کھلی آب و ہوا میں پیدا ہوئے وہیں ان کا نشوونما ہوا۔ ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال کے قصے سنے۔ جوگیوں کی صحبت پائی۔ بابا فرید، بلھے شاہ اور وارث علی شاہ کو ڈوب کے پڑھا۔ لیکن لکھا اردو میں ——— اور پھر ایسا لکھا کہ اہلِ اردو کو لوٹ ہی لیا۔ راشد، بیدی، کرشن چندر بھی پنجابی تھے۔ جن کی "پنجابیت" اتر پردیش کے اردو نویسوں کے لیے وبالِ جان بن گئی۔ لکھنؤ میں تو لوگ ایک دوسرے سے پوچھا کیے۔ 'اک صوبہ پنجاب ہے معلوم نہیں کیوں؟' جب اقبال پہلی دفعہ لکھنؤ گئے تو ان کے جانے کے بعد کسی نے اقبال کے میزبان سے پوچھا کہ 'اکبال' کے بارے میں ان کے تاثرات کیا ہیں: تاثرات خاک ہیں۔ ہم جی ہاں جی ہاں کرتے رہے اور وہ ہاں جی ہاں جی کرتے رہے۔ اور بقول شخصے:
"جب کوئی پنجابی اردو بول رہا ہو تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ جھوٹ بول رہا ہے۔"
اتر پردیش ابھی اقبال کے بوجھ سے اٹھنے نہ پایا تھا کہ پنجاب نے ایک اور رانجھا پیدا کر دیا جس کا پنجابی پن کچھ اپنے ہی انداز کا تھا جس کی شاعری میں "رُدھنا" نہایت پنجابی قسم کا ہے جو گلی کے پھیروں کی باتیں کرتا ہے جو خدا کو رب کہتا ہے جو گھر میں حقہ پیتا ہے اور باہر سگریٹ جس کو سیالکوٹ کی جنتی کی کوہنی اور گوجرانوالہ کی ارائین سے گھنگھریالے بال ساری عمر نہ بھولے جس نے جب انگریز لڑکی سے شادی کی تو نکاح نامہ میں طلاق کا حق صرف بیوی کو دیا۔

مس قرۃ العین حیدر "فن اور شخصیت" کے فیض نمبر میں لکھتی ہیں:

"ایک اردو دان پنجابی ہندو اور سکھ جس طرح اقبال اور فیض پر سر دھنتا ہے اس میں لاشعوری طور پر قبائلی تمر دبیک بھی کارفرما ہے۔ جس طرح اہل پنجاب ہندو، مسلمان اور سکھ فیض صاحب کے شیدائی ہیں یوپی، اور بہار اور دلی کے مسلمان اکٹھا اور ہندو اکٹھے ہو کر کسی واحد ادبی شخصیت کے لیے اس طرح کی والہانہ عقیدت کا اظہار نہ کریں گے کیونکہ وادی گنگ و جمن کی لسانی اور تہذیبی ثنویت میں اس قسم کی مشترکہ پرستش کی گنجائش نہیں اس کی ایک مثال پریم چند کا معاملہ ہے جن کے متعلق اردو اور ہندی والے مستقل ایک دوسرے سے رسہ کشی میں مصروف ہیں۔"

پنجاب کی مشترکہ زندگی اور مشترکہ موسیقی ان گنت حملوں کے باوجود زندہ رہی۔ پنجاب کے لوک گیت اور ناچ اور وہاں کے صوفیوں اور سنتوں کی بانی پانچ دریاؤں کے درمیان گونجتی رہی۔ یہ نغمے ہر پنجابی بچے کی وراثت ہیں۔ دراصل یہ نغمے تمام ہندوستان کی وراثت ہیں۔ فیض کو اپنی پنجابیت پر ناز تھا۔ جیسے کسی کو اپنی زندی پر ناز ہو جیسے کسی کو اپنی تہمد یا لاچے پر ناز ہو۔ وہ خدیجہ بیگم کے مہمان ہوں کراچی میں یا چمپا سنگت رائے کے چنڈی گڑھ میں، ان کی پنجابی ادائیں پرکشش تھیں۔

مرنے سے پہلے بلراج ساہنی کی طرح فیض صاحب کی بھی خواہش تھی کہ ان کا ایک آدھ مجموعہ اپنی مادری زبان میں آجائے۔ مس حیدر اپنے فیض والے مضمون میں لکھتی ہیں:

"سوال یہ ہے کہ اگر فیض احمد فیض کی مادری زبان پنجابی ہے تو وہ اس زبان میں بھی شعر کیوں نہ کہیں۔ میں نے لاہور میں فیض صاحب سمیت پنجابی دانشوروں کو وہاں کے عوامی شاعر استاد امام دین اور استاد دامن پر بے انتہا فخر کرتے پایا ہے۔ یہ لسانی سوشلزم بھی ہمارے معاشرے کی ایک خصوصیت ہے۔ اقبال جب اپنے آپ کو اکیال کہتے تھے تو اہل زبان ان پر ہنستے تھے خود میں نے ایک مرتبہ فیض صاحب سے کہا تھا ——— "خیر ہو تیری لیلاؤں کی" میر پنجابیت

بہت رہے ؟ اور "حسن بپھیر دو مجھ کو" یا "غم دل کا نصیبہ" میں کیا گُم رہے ؟"

کچھ سال پہلے بیروت سے ایک چٹھی میں اپنی بیٹی منیزہ کو انھوں نے لکھا تھا کہ وہ بوڑھا نہیں ہونا چاہتے۔ بس چلتے پھرتے ہی دنیا سے روانہ ہونا چاہتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

"اگر دس بیس برس اور جینا پڑا اور ہاتھ پاؤں جواب دے گئے تو پھر ہم گاؤں چلے جائیں گے جہاں میراثی میرا حقہ بھرے گا۔ اور میراثن میرے پاؤں دبایا کرے گی۔"

ویسے بھی فیض صاحب کو پنجاب کے میراثی بہت پسند تھے۔ وہ کہا کرتے تھے پنجاب کی تہذیب میں ان لوگوں نے نمایاں رول ادا کیا ہے۔

جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ آپ نے پنجابی میں چند نظموں کے سوا کچھ اور کیوں نہیں لکھا تو فیض صاحب سنجیدہ ہو گئے۔ فرمایا :

"کچھ تو اس لیے کہ پنجابی کے کلاسیکی شعراء بابا فرید، وارث شاہ، بلھے شاہ اور سلطان باہو نے اتنے اعلیٰ معیار قائم کر دیے تھے کہ انھیں نقطۂ آغاز بنا کر آگے بڑھنا بہت دشوار ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ کسی زبان میں شاعری کرنے کے لیے صرف اس زبان کا علم کافی نہیں اس کے لیے اظہار کی نزاکتوں پر عبور چاہیے جو کرافٹ کی کڑی تربیت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ ہمیں پنجابی میں علمی تربیت حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا نہ ہی پنجابی شاعری میں اظہار کی تربیت ملی۔"

اپنے ایک بیان کے مطابق وہ غالب جیسا ایک آدھ شعر تو کہہ گئے ہیں لیکن بلھے شاہ اور وارث شاہ کے نزدیک نہیں پہنچ پائے۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو پاک ٹی ہاؤس لاہور میں پوئٹری فورم کے جلسے کے صدارتی خطبے میں انھوں نے فرمایا کہ پاکستان کے ادیبوں کو عربی اور فلسطینی ادب پڑھنا چاہیے۔ وہ تیسری دنیا کے ادب کی باتیں بھی

کرتے رہے۔ لیکن جب پنجابی ادب کی بات آئی تو وہ ایک الھڑ پنجابی دوشیزہ کی طرح شرما گئے۔ منٹو اپنی آخری عمر میں پنجابی بولیاں اکٹھا کرتا رہا۔ استاد دامن کی صدارت میں گورنمنٹ کالج لاہور میں مرنے سے چند دن پہلے جب وہ پنجابی کی بولیاں سُناتا جاتا استاد کا دامن سرکتا جاتا۔ منٹو کہتا تھا کہ ان پنجابی بولیوں کے سامنے ساری کی ساری اُردو شاعری ہیچ ہے۔ یہ وہ ادب ہے جس کے پڑھنے سے انسان پرندوں کی زبان بھی سمجھنے لگتا ہے۔ پھر انھیں کی طرح اڑنے لگتا ہے:

لب جان گے یار گواچے
تے بیڑی پالے ہیناں نوں

کوٹھے کوٹھے آ لبھی اے
تینوں نیتو دا یار دکھاواں

دراصل بیرونِ ممالک میں طویل قیام کی وجہ سے فیض صاحب پنجابی بھول چکے تھے لیکن پنجابی لوگ انھیں نہیں بھولے۔ اُن کی یہی خواہش رہی کہ وہ پنجاب میں رہیں اور پنجابی میں بھی لکھیں۔ ان کو خوش کرنے کے لیے فیض صاحب نے پنجابی میں بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن کچھ بنا نہیں۔

پروفیسر وارث میر اپنے مضمون "فیض نے کہا" (نوائے وقت، ملتان نومبر ۲۹) میں لکھتے ہیں:

"وفات کے چند روز بیشتر جناب مسعود احمد کھدر پوش کار دار اور فخرِ زماں کی معیت میں فیض کے پاس پہنچے اور ان سے ایک ایسی تحریر پر دستخط کرنے کی درخواست کی جس کا تعلق پنجابی زبان کو اس کا جائز مقام دلانے کی جد وجہد سے تھا۔ فیض صاحب نے اس کاغذ پر دستخط کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ آمریت کو ختم کرنے کا پروگرام بھی شامل تحریر کر لو تو میں دستخط کر دوں گا۔"

لکھنؤ میں اس کے بالکل الٹ ہوا۔ جب فیض صاحب اپریل ۱۹۸۱ء میں وہاں گئے تو ایک اُردو اخبار نے لکھا کہ فیض صاحب اُردو کے مخالف اور پنجابی کے علمبردار ہیں لہٰذا وہاں ان کا کوئی جلسہ یا جلوس نہ نکلے ——— فیض صاحب ہمیشہ چاہتے رہے کہ پرانی رزمیہ نظموں کے پیمانے پر کوئی بڑی چیز لکھیں جس میں اپنے دور کی کشمکشِ حیات کا بیان ہو سکے۔ فیض صاحب کو علم تھا کہ ایسی رزمیہ نظم صرف

پنجابی میں ہی ممکن ہے جو وہ نہیں لکھ سکے۔

فیض امرتسر میں پانچ سال رہے جہاں اُن کا تعارف امرتسر کی ادبی ہستیوں سے ہوا۔ سجاد ظہیر، منٹو، ڈاکٹر رشید جہاں، محمود الظفر، ڈاکٹر کچلو، یہ سبھی لوگ نہ صرف پنجابی تھے بلکہ اپنے پنجابی اسٹائل پر فخر کرتے تھے۔ امرتسر میں ہی فیض صاحب کا پہلا عشق ہوا۔ "نقشِ فریادی" میں ان کے ابتدائی عشق اور رومان پوشیدہ نہیں بلکہ نمایاں ہیں۔ پنجاب کے عاشقوں کے لیے "نقشِ فریادی" ایک ٹکسٹ بک کی حیثیت رکھنے لگی۔ عشق کے نصاب کی سب سے اہم کتاب۔ ایک نقاد کا کہنا ہے کہ فیض کے اشعار لڑکیوں کی زبان سے اور بھی پیارے لگتے ہیں۔ لیکن جب نورجہاں فیض کو گانے لگیں تو سانس پھول گیا۔ جب منٹو نے وجہ پوچھی تو جواب ملا۔ وہی عورتوں والی بیماری۔

فیض گلابی جاڑوں کا شاعر تھا۔ گھنے درختوں پر سوئی ہوئی چاندنی کو تھپکیاں دینے والا شاعر۔ لیکن اپنے گاؤں کالا قادر کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ آج وہاں کی دیہاتی لڑکیاں اپنے بالوں میں پلاسٹک کے کلپ لگائی ہیں اور لڑکے سیالکوٹ میں آکر سیفٹی شو دیکھتے ہیں۔

فیض کا کہنا ہے کہ ان کے سب سے بہترین دن امرتسر میں ہی گزرے ہیں۔

۱۹۵۶ء میں جب دہلی میں افرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس ہوئی تو فیض صاحب نے ہوائی جہاز کے بدلے واہگہ سے امرتسر بذریعہ ریل آنا زیادہ پسند کیا۔ عبادت بریلوی، شوکت تھانوی، قتیل شفائی، اعجاز بٹالوی اور مولانا عبدالمجید سالک ان کے ساتھ تھے۔ باقی عبادت صاحب کی زبانی سنیے:

"ہم سب لوگ صبح کو فیض کی جائے قیام (لاہور) پر جمع ہو گئے اور واہگہ کے راستے امرتسر پہنچے۔ دن امرتسر میں گزرا۔ میں نے اس سے قبل امرتسر نہیں دیکھا تھا۔ فیض مجھے امرتسر کے تنگ و تاریک بازاروں میں لے گئے۔ جلیان والا باغ دکھایا۔ دربار صاحب اور ہال بازار کی سیر کرائی۔ مرحوم ایم۔ اے۔ او کالج کی عمارت میں لے گئے اور یہ بتایا کہ وہ اس کمرے میں بیٹھتے تھے۔ یہاں تاثیر صاحب لیکچر دیتے تھے۔ پھر سول لائنز کے مختلف مکانوں کی طرف اشارہ کر کے یہ بتاتے رہے کہ میں یہاں رہتا تھا۔ اس مکان میں ہماری شادی ہوئی تھی۔ اس جگہ ہم نے اپنی زندگی کے بہترین دن گزارے تھے۔"

جب پوچھا گیا کہ فیض صاحب فلاں شعر میں آپ نے "مینار" کو مؤنث کیوں لکھا ہے۔ بولے امرتسر

میں تو اسے مؤنث ہی سمجھتے ہیں۔ لندن میں بھی وہ "دیوانہ" نام کے ریسٹورنٹ میں جا کر چاٹ، پوری اور اصلی پنجابی لسی کڑے والے گلاس میں پیتے تھے۔ یہ کڑے والا گلاس خاص امرتسر کی دین ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن فیض صاحب کو بیروت میں پنجابی لسی کی طلب ہوئی۔ جب کہیں سے نہ ملی تو خود بنا کے پی۔ امرتسر کے بعد وہ لاہور پر مرتے تھے۔ لندن میں لاہور کباب ہاؤس ضرور جاتے تھے۔ امرتسر کے پاپڑ اور بڑیاں ان کو کبھی نہ بھولیں۔ امرتسر میں ان کی سب سے پہلی ملاقات ڈاکٹر تاثیر کے ساتھ ہوئی جو بعد میں ان کے ہم زلف بنے۔

ڈاکٹر تاثیر مسلم کالج امرتسر کے پرنسپل بننے سے پہلے لندن میں پی ایچ ڈی کرنے گئے تھے اور واپسی پر ایک میم کو بیوی بنا کے لے آئے تھے۔ اس کی بیوی نے جب ایک خوبصورت بچے کو جنم دیا تو اس کی چھوٹی بہن ایلیس اسے دیکھنے امرتسر آئی۔ جب فیض نے اس نوجوان دوشیزہ کو دیکھا تو پہلی نظر میں پیار ہو گیا۔ امرتسر والے پرانے دوستوں کو یاد ہے کہ فیض اور ایلیس گھنٹوں رام باغ کے بنچ پر بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ یار دوست حیران تھے کہ بغیر انگلینڈ گئے انگریز لڑکی سے شادی ہو گئی۔ خیر جب شادی کا وقت آیا تو ڈاکٹر تاثیر سری نگر کے کالج کے پرنسپل ہو گئے تھے۔ لہٰذا شادی سری نگر کی خوبصورت فضا میں ہوئی۔ شیخ محمد عبداللہ نے نکاح پڑھوایا۔ بخشی غلام محمد اور غلام محمد صادق براتی بنے۔ کشمیر نیشنل کانفرنس کے تمام عہدیداران شادی میں شریک ہوئے۔ ایسے لگتا تھا جیسے کشمیر نیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ ہو رہا ہے:

ہے وہی عارضِ لیلیٰ وہی شیریں کا دہن
نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پا بجولاں چلو

دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

—— دستِ تہِ سنگ

باب : پانچ

وہ شاعر تھا چچا

فیض اقبال کو چچا کہتے تھے۔

وہ انھیں اپنے استادوں میں شمار کرتے تھے۔ انھیں اس پر ناز تھا کہ وہ بھی سیالکوٹ کی سرزمین سے اُٹھے ہیں۔ ان کے والد کو اقبال سے نیاز حاصل تھا ——— "ابا اور وہ ساتھ بھی رہے۔ ساتھ ہی انھوں نے بیرسٹری کی اور ساتھ ہی لندن سے آئے تھے۔ اگرچہ وہ ہمارے سامنے سیالکوٹ میں کبھی نہیں رہے۔ جب ہم نے ہوش سنبھالا تو وہ لاہور جا چکے تھے" ——— وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ شاعری میں وہ ان کی خاکِ پا بھی نہیں۔ علامہ بہت بڑے شاعر تھے۔ اپنے خاص موڈ میں انھوں نے فرمایا: ——— "اگر علامہ نے سوشلزم کے معاملے میں ذرا سنجیدہ ہو جاتے تو ہمارا کہیں ٹھکانہ نہ ہوتا" ———

فیض صاحب نے ایک مرتبہ خالد حسن کو بتایا کہ ان کے بچپن میں والد ان کو انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے سالانہ جلسے میں لے گئے تھے۔ علامہ اقبال بھی اسٹیج پر جلوہ افروز تھے۔ فیض سے تلاوتِ قرآن کروائی گئی۔ "میں اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے ایک اونچی میز پر کھڑا کیا گیا۔ جب میں تلاوت کر چکا تو اقبال نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا: تم کتنے ذہین اور اچھے بچے ہو۔"

گورنمنٹ کالج لاہور کے مشاعرے میں جب فیض نے پہلی بار اپنی نظم پڑھی تو علامہ اقبال نے ان کو بلایا اور

شاباشی دی۔ علامہ کے انتقال پر انھوں نے ایک نظم لکھی جس میں انھیں "خوش نوا فقیر" اور "شاہِ گدا نما" کہہ کر خراجِ عقیدت پیش کیا:

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھی چند ہی نگاہیں جو اُس تک پہنچ سکیں
پر اُس کا گیت سب کے دلوں پر اُتر گیا
اب دُور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اُداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں

نہایت ہی پنجابی قسم کا خراجِ عقیدت ہے جو صرف ایک پنجابی دوسرے پنجابی پر لکھ سکتا ہے۔ اقبال کی اپنی نظمیں گورونانک اور سوامی رام تیرتھ پر اسی قسم کی ہیں۔ لیکن بہت جلد وہ خراجِ عقیدت کی حد سے آگے گزر جاتے ہیں۔ کہتے ہیں:

"اقبال کو کسی تحریک کی چار دیواری میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا ایک قدم پرانے وطن پرستوں میں ہے اور دوسرا موجودہ ترقی پسندوں میں قوم اور وطن کے بعد انقلاب اور مزدور اور سرمایہ کا جو دور آیا اس کی بھی پہلی جھلک ان ہی کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔"

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

خالد حسن کا خیال ہے کہ: ———

"فیض صاحب اقبال کے بہت زبردست معتقد تھے لیکن زندہ

پائندہ اقبال تک۔ اُس اقبال تک نہیں جسے قلم فروشوں، بوگس ناقدوں
اور خودساختہ نظریہ پرستوں نے ایک قدیم ڈھانچے میں تبدیل کر دیا
ہے۔ فیض صاحب اکثر کہتے ہیں کہ وہ ایک طویل دیباچے کے ساتھ "انتخاب
اقبال" شائع کریں گے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اسلام اور دوسرے بنیادی سوالات
پر علامہ مرحوم کے اصل نظریات اُن کی انگریزی تحریروں میں موجود ہیں۔
غالباً اسی وجہ سے انھوں نے ان خیالات کو انگریزی میں قلمبند کیا تاکہ وہ
رجعت پسندوں کی دسترس سے باہر رہیں کیونکہ اب رجعت پسندوں کے
اکثریت ہمارے ہاں انگریزی بولتی ہے۔"

فیض لباس کے بارے میں بھی اقبال سے متاثر تھے۔ ان کی ڈھیلی ڈھالی پتلون اُن کی بے پرواہی سے
باندھی ہوئی نکٹائی اُن کا درزیوں سے کترانا اقبال کی یاد دلاتا ہے۔ درزی ایک بار آ کے ناپ لے گیا وہی ناپ
چلتا رہا۔ اقبال گھر میں بنیان اور دھوتی میں بیٹھتے تھے اور حقہ پیتے تھے۔ فیض بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ اقبال کی
بیٹی کا نام منیرہ تھا۔ فیض نے بھی اپنی ایک بچی کا نام منیرہ رکھا۔ دونوں خوش خوراک اور خوش طبع انسان تھے۔
اقبال کے اسکول دیر سے آنے والے قصے کو سبھی جانتے ہیں۔ فیض جب امرتسر میں پڑھاتے تھے تو پرنسپل تاثیر نے
پوچھا کہ آپ کلاس میں دیر سے کیوں آتے ہیں کہنے لگے فیض اکثر دیر سے آتا ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر خارجہ فقیر عزیز الدین کے پڑپوتے فقیر سید وحید الدین ایک قصہ سُنایا
کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کے قریبی رشتہ دار سید واجد علی کو کتے پالنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دفعہ وہ ان کے
ساتھ موٹر کار میں بیٹھ کر ڈاکٹر اقبال سے ملنے گئے۔ موٹر میں اُن کے کتے بھی تھے۔ وہ لوگ تو ڈاکٹر صاحب
کے پاس جا بیٹھے لیکن کتے کار میں ہی چھوڑ آئے۔ تھوڑی دیر بعد اقبال کی بچی منیرہ بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔
"ابا جان موٹر میں کتے آئے ہیں"۔ اقبال نے ہماری طرف اشارہ کر کے کہا: "نہیں بیٹا
یہ تو آدمی ہیں"۔ ——— میں نے یہ قصہ فیض صاحب کے نام سے کئی بار سنا ہے۔ کچھ اور اقبال والے
لطیفے بھی فیض سے منسوب ہیں۔

علامہ کے انتقال کے وقت فیض امرتسر میں پڑھاتے تھے۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو جب علامہ نے
اس دارِ فانی سے کوچ کیا تو فیض کلاس سے سیدھے لاہور پہنچے۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک یعنی پاکستان ٹائمز کی ایڈیٹری سے لے کر راولپنڈی کیس میں گرفتاری
تک لاہور ہی میں رہے۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۸ء تک پھر تقدیر لاہور لے آئی۔ لاہور ان کے لیے روشنیوں کا شہر
ضرور تھا لیکن لاہور سیالکوٹ کے بعد علامہ اقبال کا بھی شہر تھا۔ اقبال کے نقشِ قدم پر چلنا وہ باعثِ فخر
سمجھتے تھے۔ ملک کی سیاست میں ان کا خاصا رول رہا ہے۔ کوئی بھی حکومت انھیں کبھی نظر انداز نہیں

کرسکی بلکہ بقول مس حیدر۔ ۔ ۔ ہر نئی پاکستانی حکومت کے افسرانِ بالا اور وزراء فیض صاحب کی "دربارداری" کرتے تھے۔ کچھ تو ان کی بستہ برداری کرتے ہوئے بھی پکڑے گئے۔ جس طرح اقبال اپنی حیات ہی میں ایک LEGEND بن گئے فیض بھی اپنی زندگی ہی میں ادبی اور سیاسی باکس آفس اسٹار تھے جن کا ہر شعر ہٹ تھا۔ جب ایڈیٹر تھے تو ہر روز چھپتے تھے۔ جب ایڈیٹر نہ تھے تب دوسرے ایڈیٹر ہر روز چھاپتے تھے۔
فیض صاحب نے اقبال پر ایک فلم بھی بنانا چاہی تھی لیکن علی سردار جعفری بازی لے گئے اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ ویسے تو فیض نے دو پاکستانی فلموں کے لیے گانے اور مکالمے لکھے۔ ایک فلم ہے "جاگو ہوا سویرا" جسے ۱۹۵۹ء میں بین الاقوامی اعزاز ملا۔ دوسری فلم ہے "دور ہے سکھ کا گاؤں" جو آج تک مکمل نہیں ہوئی۔
ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا:

"وہ کئی دفعہ علامہ اقبال سے روبرو ملے۔ ایک تو وہ ہم وطن تھے۔ دوسرے میرے والد کے دوست بھی تھے۔ اس لیے کہ دونوں ہم عصر تھے۔ اور انگلستان میں بھی وہ ایک ساتھ رہے تھے۔ اور جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہونے گیا تھا تو علامہ سے ہی خط لے گیا تھا۔ قاضی فضل حق صاحب کے لیے۔ اور اس کا مجھے افسوس ہے کہ وہ خط قاضی صاحب نے تھما لیا۔ جب انٹرویو ختم ہوا تو میں نے کہا: وہ خط مجھے دے دیجیے۔ انھوں نے کہا نہیں یہ تو میرے پاس رہے گا۔ پھر جب علامہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کر کے آئے تھے لندن سے واپس لوٹے تھے تو ہم گورنمنٹ کالج کی طرف سے اور بہت سی انجمنوں کی طرف سے ایک مشترکہ استقبالیہ دیا تھا۔ پھر ایک دفعہ گورنمنٹ کالج کے سالانہ مشاعرے میں ایک مقابلہ ہوا تھا۔ شعر اور اس کا موضوع تھا "اقبال" —— اس پر بھی ہمیں انعام ملا تھا۔ اس کے بعد تاثیر صاحب، صوفی صاحب، سالک صاحب کے ساتھ دو تین دفعہ حاضری کا موقع ملا۔"

راجہ غضنفر علی خاں کے بارے میں لکھتے ہوئے فیض نے دلی کے ایک یوم اقبال کا ذکر یوں کیا ہے: ——

"۲۱ اپریل ۵۵ء میں جیل سے رہائی کے بعد گھر پر میرا پہلا دن تھا۔ صبح ہی صبح راجہ صاحب تشریف لائے، جب وہ دلی میں ہمارے ہائی کمشنر تھے۔ آتے ہی انھوں نے اپنا مخصوص قہقہہ بلند کیا اور کہنے لگے ——— "تم بھی خوب وقت پر آئے۔ کیا TIMING کی ہے۔ اگلے مہینے ہم یوم اقبال پر دلی میں مشاعرہ کر رہے ہیں۔ تم بھی چلو" ——— میں نے کہا: راجہ صاحب ابھی تو پوری طرح گلو خلاصی بھی نہیں ہوئی۔ ضمانت کی رسی گلے میں پڑی ہے۔ بھلا مجھے دہلی کون جانے دے گا، بھاگ جاؤں تو ———؟

"ہاں جی۔ وہ ہمارا ذمہ ہے" راجہ صاحب نے فرمایا۔

میں نے ہاں تو کر دی۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ راجہ صاحب اپنی مسلمہ قدرت کار کے باوجود ایسی مہم میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ چند دنوں کے بعد واقعی دہلی جانے کا پروانہ مل گیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اگلے مہینے دہلی میں جب راجہ صاحب کا دربار دیکھا۔ ان کے دروازے پر ہاتھی تو نہ جھومتے تھے لیکن اہل دہلی اور خاص طور پر خاکساروں کے ٹھٹ ضرور لگے رہتے تھے۔ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ کسی بدیسی سفیر کا مکان ہے۔ یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کسی حاکم اعلیٰ کا ایوان ہے۔ بہت دھوم کا مشاعرہ ہوا۔ صدر مسند ڈاکٹر رادھا کرشنن صدر تھے۔ ہزاروں کے مجمع نے رات بھر مشاعرہ سنا۔ اگلی صبح راجہ صاحب میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے ——— "میں نے رات پروٹوکول کے خیال سے پنڈت نہرو کو مدعو نہیں کیا تھا۔ ابھی انھوں نے ٹیلی فون پر شکایت کی ہے کہ یوم اقبال پر مشاعرہ ہوا اور ہمیں نظر انداز کیا گیا۔ آج شام وہ صرف پاکستانی شعراء کو سننے کے لیے آ رہے ہیں۔ تم ذرا سید محمد جعفری اور زہرہ نگاہ کو اطلاع کر دو" ———

فیض کی نظمیں پچاس سال تک فضائیں گونجتی رہیں لیکن انھوں نے کبھی غزل کو ترک نہیں کیا۔ خو
انھوں نے ایک بیان میں کہا ہے:

"یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے غزل کو ترک نہیں کیا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس میڈیم میں ہم نے نئے مضامین نظم کے رنگ میں باندھے ہیں مگر یہ غلط ہے کہ اس کی ابتدا ہم نے کی ہے۔ ہم نے تو محض غالب اور علامہ اقبال کی پیروی کی ہے۔ ہم نے غزل کو ترک نہیں کیا۔ جیسا کہ غالب اور اقبال نے اس میڈیم کو ترک نہیں کیا تھا۔ یہ خوبصورت میڈیم ہے لیکن وقت کے تقاضوں کے ساتھ اس میں تبدیلی آنا ضروری ہے۔ یہ انقلاب ہم نہیں لائے۔ اس کا سہرا تو غالب اور اقبال کے سر ہے۔ کیونکہ وہ بہت بڑے استاد ہیں۔ ہم نے تو ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ فیض بھی اقبال کی طرح اسلامی فکر کو اپنی شاعری کا سرچشمہ بنانا چاہتے تھے اور سچ تو یہ بھی ہے کہ وہ مارکسزم کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرنا چاہتے تھے۔ سردار جعفری بھی اور کیفی اعظمی بھی۔ اپنی نظم "اشتراکیت" میں ڈاکٹر اقبال کا اشارہ صاف ہے:

بے سود نہیں روس کی یہ گرمی رفتار

کہتے ہیں اقبال کی نظم میں چار نظام ہیں۔ شہنشاہیت، فاشزم، اشتراکیت اور اسلام۔ کافی ہاؤس کے جوک کے مطابق فیض کی نظم کا صرف ایک نظام ہے وہ ہے نظام حیدرآباد۔ اقبال کا اردو شاعری میں مقام بہت بلند ہے لیکن فیض کا مقام صحت افزا ہے۔
جب ان سے پوچھا گیا کہ اقبال مرحوم کے پاس اکثر جانے کے باوجود ان کی شاعری کا کوئی اثر نہیں پڑا تو فیض صاحب نے جواب دیا:

"اقبال سے نیاز مندی کا شرف حاصل رہا۔ ان کی صحبت سے فیض اٹھانے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ لیکن آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ان کی شاعری سے میں متاثر نہیں ہوا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی طور سے ان کے کلام اور میرے کلام میں اتحاد پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا طرز کلام دوسرا ہے اور میرا دوسرا۔ لیکن جہاں تک انسان دوستی، انسان کی عظمت، عدل و انصاف، استحصال کا خاتمہ، آزادی، ظلم و جبر کے خلاف احتجاج، یہ ہم دونوں میں

مُشترک ہے ۔۔۔۔

اختلاف کے بارے میں انھوں نے فرمایا کہ :

"بڑے شاعر خواہ وہ اقبال ہوں یا سعدی یا غالبؔ اُن سے اختلاف کا معاملہ نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ اُن کا زمانہ کچھ اور ہے اور اِس دَور کے مسائل کچھ اور ہیں۔ اُس زمانے میں معاشرہ کا رنگ دُوسرا تھا، اَب دُوسرا ہے۔ یہ اختلاف کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ اِجتہاد کا مسئلہ ہوتا ہے۔ ویسے بہت سے مسائل جو اس زمانے میں تھے وہ اَب بھی ہیں اور اس پر اختلاف بھی نہیں۔ مثال کے طور پر اقبال کو آزادی کی بڑھتی ہوئی جنگ کو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ پھر پاکستان بننے کے بعد بہت سارے مسائل پیدا ہوئے تو ظاہر ہے کہ وہ باتیں آپ کو اُن کے کلام میں نہیں ملیں گی۔ یہ سارے مسائل بعد میں پیدا ہوئے۔ اس کو اختلاف تو نہیں کہنا چاہیے۔"

فیض صاحب کو شہر بھوپال بہت پسند تھا۔ اس لیے نہیں کہ ان کا وہاں استقبال شاہوں والا ہوا کرتا تھا بلکہ بقول ان کے اس شہر نے اقبال کے آخری ایام میں ان کی بیماری، تیمارداری اور میزبانی کے اخراجات اٹھائے تھے۔ ویسے بھی فیض صاحب بھوپال میں اپنی وردی والے دنوں میں بھی آئے تھے۔
فیض صاحب اقبال کا اس وجہ سے بھی احترام کرتے ہیں کہ آخری عمر میں اقبال سوشلسٹ ہو گئے تھے۔ ویسے بھی فیض صاحب اسلامی سوشلزم کے حامی تھے۔ حسرت موہانی والے اسلامی سوشلزم کے، بھٹو کے نعرے والے سوشلزم کے نہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ روس والا سوشلزم کیوں نہیں تو بولے : "اب بنفشہ تو ہر چیز کا علاج نہیں ہے" ۔۔۔۔

فیض احمد فیض

اب صاحبِ انصاف ہے خود طالبِ انصاف
مہر اس کی ہے میزان بہ دستِ دگراں ہے

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

——— سرِ وادیِ سینا

باب : چھ

میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے

سنہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے ——

ایک دن اُردو حلقوں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ فیض احمد فیض نے کالج کی ملازمت چھوڑ کر فوج کی نوکری شروع کر دی ہے۔ کالج میں وہ انگریزی پڑھاتے تھے۔ فوج میں وہ انگریزی وردی پہننے لگے۔ کالج میں وہ لیکچرار تھے، فوج میں لیفٹننٹ کرنل بنے۔ کالج لاہور میں تھا، فوج کا دفتر دہلی میں۔ کالج میں وہ انگریزی ادبیات پڑھاتے تھے۔ فوج میں ان کا تعلق محکمہ تعلقات عامہ کے اس محکمہ میں ہوا جس کا کام جنگ کی پبلسٹی اور پروپیگنڈا کرنا تھا۔ دفتر تھا اولڈ سکرٹریٹ، کبھی کبھی سرکاری کام کے لیے ساؤتھ بلاک جایا کرتے تھے۔ اس خبر پر ہفتوں بلکہ مہینوں بحثیں ہوئیں کیونکہ فیض اُردو شاعری میں اپنا سکہ جما چکے تھے۔ مشاعرے لُوٹ چکے تھے۔ اداسی اور تنہائی کو عربی اور فارسی سے گھسیٹ کر اُردو میں لا چکے تھے۔ محبوب کو نئے اشارے کر چکے تھے۔ "نقشِ فریادی" کا گہرا نقش قائم کر چکے تھے۔ اور عشق کی کئی نئی منزلیں عبور ہو چکی تھیں۔ فیض کا فوجی افسر بن جانا ایک اچھا خاصا اسکینڈل تھا۔ ادکار کے فیض والے نمبر میں ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں: ——

"یہ خبر سُن کر افسوس بھی ہوا اور کسی حد تک غصہ بھی آیا۔ اس خیال سے کہ فیض جیسا حساس اور لطیف مزاج رکھنے والے شاعر کو ایسا نہیں

کرنا چاہیے تھا۔ ترقی پسندوں نے اس کو سراہا اس لیے کہ اس جنگ میں روس بھی شامل تھا ——— اور اس لیے یہ جنگ امن اور انسانیت کی جنگ ہو گئی تھی۔ لیکن میں اس خیال سے مطابقت پیدا نہ کر سکا اور فیض کی یہ فوجی ملازمت مجھے کچھ اچھی نہیں معلوم ہوئی۔ لیکن پھر ان خیالات سے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ انسان مجبور ہوتا ہے۔ جنگ نے حالات خراب کر دیے ہیں۔ معاشی اور اقتصادی نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ گرانی بڑھ گئی ہے۔ جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ زیست دشوار ہے یونیورسٹی اور کالج کی ملازمت سے کیا ملتا ہے۔ حالات نے فیض کو مجبور کر دیا ہوگا۔ اسی زمانے میں مجاز نے ریڈیو کے ایک مشاعرے میں اپنی وہ نظم پڑھی جس کا مصرع تھا:

کرنل نہیں ہوں خان بہادر نہیں ہوں میں

اور جس کی وجہ سے عرصہ تک لکھنؤ ریڈیو میں ان کا داخلہ بند رہا۔ دراصل اس میں فیض کی اس ملازمت کی طرف اشارہ تھا اور مجاز کو بھی یہ بات پسند نہیں تھی۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف کسی عام مشاعرے میں بلکہ ریڈیو کے مشاعرے میں یہ نظم پڑھی اور اس پر خاصے عرصے تک ہنگامہ ہوتا رہا۔ فیض کئی سال دلی میں رہے۔ اس زمانے میں میرا تقرر بھی اردو کے لیکچرار کی حیثیت سے اینگلو عربک کالج دہلی میں ہو گیا۔"

فیض صاحب نے ایک بار فرمایا تھا کہ دورانِ جنگ اچھے اچھے تیس مار خاں نوکریوں کی تلاش میں سڑکوں کی خاک چھانتے پھرتے نظر آتے تھے۔ پھر انھوں نے تیس مار خاؤں کو کیسے پیچھے چھوڑ دیا یہ اردو والوں کے لیے ایک معمہ سا بن کر رہ گیا ہے۔

فیض فوج میں کیوں اور کیسے بھرتی ہوئے اس کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے۔ خود فیض صاحب نے اس کے بارے میں زیادہ نہیں لکھا ——— "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" میں ڈاکٹر ایوب مرزا کے ساتھ ایک انٹرویو میں فیض نے بتایا:

"ہم لاہور میں پڑھاتے تھے۔ میجر مجید ملک کے کہنے پر ہم دہلی گئے۔ بریگیڈیئر جیوس سے انٹرویو ہوا۔ وہ خوش نہ تھا کہ ہم

فوج میں آجائیں۔ مجید ملک نے ہمیں کرنل بیرڈ BEARD سے ملنے کو کہا۔ کرنل BEARD. نے اندر کی بات بتائی۔ کہنے لگے: خفیہ فائل میں لکھا ہے:

"You are an advanced Communist" یعنی تم بہت کمیونسٹ ہو۔"

ہم نے پوچھا "Are there retarded Communists?"

کرنل ہنسنے لگا۔ بولا: "You are enlisted" مسٹر فیض ذرا خیال رکھنا۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد پھر بولا:

"Are you an advanced Communist?"

ہم نے کہا: I am not a member

فیض کے دوست مظہر علی کے ساتھ کوئی ایسا انٹرویو نہیں ہوا لیکن وہ بھی ان کے ساتھ پاس ہوئے۔ یہ واقعہ ۱۹۴۲ء کا ہے۔ فیض کو کیپٹن کا عہدہ دیا گیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ فوجی کاغذات میں نام فیض احمد فیض اتفاقاً لکھا گیا۔ اور وہی نام چلتا رہا۔ ۱۹۴۳ء میں فیض میجر بنے۔ ۱۹۴۴ء میں لیفٹیننٹ کرنل۔ ۱۹۴۶ء میں فوج کی طرف سے ایم بی اے کا خطاب ملا۔ یکم جنوری ۱۹۴۷ء کو فوج سے ریلیز۔ تقریباً ساڑھے چار سال فیض صاحب نے انگریزی فوجی وردی پہنی اور برطانوی سرکار سے داد وصول کی۔
اپنی سیاسی زندگی کے آغاز کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سیاست سے میری دلچسپی کا آغاز ۱۹۳۵ء میں ہوا جب کہ لاہور کے وائی ایم سی اے ہال میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ہوئی تھی اور میں اس انجمن کا پہلا سکریٹری منتخب ہوا تھا۔ میں نے امرتسر کے صنعتی علاقے میں کام کرنا شروع کیا اور مزدوروں کے مسائل میں عملی دلچسپی لینا شروع کی۔ ان دنوں میں امرتسر میں لیبر فیڈریشن کا رکن تھا۔ اس فیڈریشن کا آل انڈیا ٹریڈ یونین سے الحاق ہو گیا تھا۔ پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن اسی ٹریڈ یونین کانگریس کی وارث ہے۔"

دوسری جنگ عظیم چھڑی۔ دلی میں ہر طرف وردیاں ہی وردیاں۔ درزی مالا مال ہو گئے۔ بھرتی

زور پکڑ گئی۔ ادیبوں کے وارے نیارے ہو گئے۔ کل جو فرنگی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی باتیں کرتے تھے آج ٹوڈی بن گئے۔ دلّی کے مشہور ماہنامہ ادبی رسالے کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی اس سین کو یوں بیان کرتے ہیں:

"جب دوسری عالمگیر جنگ نے زور پکڑا تو یہ عجب کایا پلٹ ہوئی کہ ہمارے بعض ادیب جو فرنگی حکومت کے سخت مخالف تھے فوجی دفتروں میں اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کے لیے ایک دم سے چولا بدل کر حکومت کے وفادار ہو گئے۔ سب سے پہلے مجید ملک فوجی وردی پہنے نئی دلی میں دکھائی دیے۔ مجھے تو جھٹکا سا لگا۔ مگر وہاں آنکھ پر میل تک نہیں تھا۔ ان کے بعد ڈاکٹر تاثیر ایک فوجی دفتر کے ڈپٹی ڈائریکٹر بن کر آ گئے۔ انھیں دیکھ کر اور بھی زیادہ افسوس ہوا کیونکہ یہ تو کھدّر کا کرتہ اور کھدّر کا پاجامہ پہنا کرتے تھے۔ اس کے بعد فیض صاحب دکھائی دیے، کپتان کی وردی پہنے ہوئے۔ حد یہ کہ کچھ دنوں بعد چراغ حسن حسرت بھی وردی پہنے ایک فوجی اخبار کی ایڈیٹری کرنے لگے ——— ایک صاحب تھے عارف، آل انڈیا ریڈیو میں، انھوں نے ریڈیو چھوڑ کر وردی پہن لی۔ ایک اور صاحب تھے بدر، وہ بھی وردی میں دکھائی دینے لگے۔ حد یہ کہ ن، م، راشد بھی ریڈیو چھوڑ کر وردی پوش ہو گئے۔ وردی میں سب سے بے ہنگم حسرت مرحوم اپنے بے ڈول جسم اور فٹ بھر آگے چلنے والی توند کی وجہ سے لگتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے وردی کو نہیں بلکہ وردی نے ان کو پہن لیا ہے۔ اور سب سے زیادہ افسوس فیض صاحب کو دیکھ کر ہوتا تھا کہ یہ شریف آدمی کیوں اس چکر میں پھنس گیا؟ اس وقت روایت یہ مشہور بھی کہ تاثیر نے فیض کو پھانسا ہے تاکہ وہ فخر سے یہ کہہ سکے کہ دیکھو میں نے خطِ غلامی نہیں لکھا۔ مرحوم سے یہ کچھ بعید بھی نہیں تھا کہ: ———

ہم تو ڈوبیں گے صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

کہہ کر دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں ———

ویسے بھی وہ اُن کے ہم زُلف تھے۔ ادیبوں کی ایک ٹولی آل انڈیا ریڈیو میں پطرس بخاری کے جھنڈے تلے اکٹھا ہو گئی تھی، دوسری جنگِ عظیم "لوگوں کی جنگ" People's War قرار دے دی گئی۔ پھر کیا تھا یہ سارے وردی پوش گنگا نہا لیے۔

اُن دِنوں میونسپل کارپوریشن چاندنی چوک کے بڑے ہال میں ترقی پسند ادیبوں کے خلاف ایک جلسہ ہُوا۔ سر رضا علی اس کے صدر بنائے گئے مولوی سعید احمد بھی بولے ——— میراجی راشد اور مخمور جالندھری کی نظموں کا مذاق اُڑایا گیا۔ ترقی پسندوں کی طرف سے فیض صاحب بھیجے گئے تھے۔ فوجی وردی میں وہ آدھمکے۔ لیفٹننٹ کرنل کا عہدہ شانے پر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ بقول سجاد ظہیر اُن کا لباس بھی دلی والوں کو غیر ادبی معلوم ہُوا ہوگا۔ مجھے کس قدر گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ فیض سے میں نے کہا: "کپڑے تو بدل لیے ہوتے"۔ فیض صاحب کی خاکی وردی والی تقریر سبھی کو یاد ہے۔

فیض کی ایک نظم ہے "سیاسی لیڈر کے نام" اس میں اس وقت کے لیڈروں پر نکتہ چینی کی ہے۔ "ماہ و سال آشنائی" میں لکھتے ہیں کہ یہ نظم انھوں نے گاندھی جی پر لکھی تھی کیونکہ انھیں گاندھی کی پالیسی سے اختلاف تھا ——— ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ چونکہ ان ذہنی تربیت دینی ماحول میں ہوئی ہے اور جیل میں بھی انھوں نے قیدیوں کو قرآن پڑھایا ہے۔ ان کے سیاسی عقائد اور دینی عقائد میں کوئی اختلاف نہیں۔ اب یہی وہ جگہ ہے جہاں انھوں نے کمیونزم کو نیا موڑ دیا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ مذہبی بحث انھیں بالکل پسند نہیں ہے۔ پسند بھی کیسے ہو، یہ بحث تو بڑے بڑوں کو ننگا کر دیتی ہے۔

جب فوج میں فیض صاحب کے دن پورے ہونے لگے تو محکمہ داخلی امور کے ڈپٹی سکریٹری عظیم حسین کی سفارش سے فیض صاحب کی نامزدگی انڈین فارن سروس میں ہوتے ہوتے رہ گئی۔ سردار پٹیل بھی مان گئے تھے لیکن بیچ میں قائدِ اعظم کا نیا پرچہ "پاکستان ٹائمز" حائل ہو گیا۔

ایک دن میاں افتخار الدین ہمارے پاس آئے کہنے لگے: "بھئی وہ دیکھو ہم پاکستان ٹائمز لاہور سے نکال رہے ہیں۔ قائدِ اعظم بہت آرزو مند ہیں کہ پرچا بہت اعلیٰ اسٹینڈرڈ کا ہو۔ میں نے تمھارا نام چیف ایڈیٹری کے لیے تجویز کیا ہے"۔

فیض گھبرا سے گئے۔ کہنے لگے : " میاں آپ کمال کر رہے ہیں ۔ مَیں نے جرنلزم میں کبھی قدم نہیں رکھا۔ اتنا بڑا پرچہ کیسے چلا سکتا ہوں ۔ نا بابا معاف کریں ۔"

میاں صاحب ناراض ہوئے کہنے لگے : " مَیں کوئی بے وقوف ہوں ۔ تم نے مجھے کیا جاہل سمجھا ہے جو تمہارا نام تجویز کر آیا ہوں ۔ اور پھر اگر ناتجربہ کاری دلیل ہے تو فوج کا تجربہ تمھیں کہاں تھا؟ بس اب فوج سے ریلیز کے لیے درخواست بھیج دو ۔ دو ماہ میں پرچہ سڑکوں پر ہونا چاہیے ۔"

مَیں نے ریلیز کے لیے درخواست بھیج دی ، وہ منظور ہو گئی ۔ مگر میاں صاحب لوٹ کر نہ آئے ۔ ہم نے بھی پھر میاں صاحب سے نہ پوچھا کہ بھئی کہاں گیا آپ کا پرچہ ——— اُدھر ہم سردار پٹیل والے انٹرویو میں بھی نہیں گئے ۔ ہمارے دوست عظیم حسین ہم سے خفا ہو گئے کہ پٹیل صاحب ہمارا انتظار کرتے رہے اور ہم نہ پہنچے ۔ بہر حال اب سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے ۔ ہم نے فوج میں چھ ماہ کی Extention لے لی ۔

ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ میاں صاحب وارد ہوئے اور کہنے لگے :

" بھئی بس اب چلو ۔"

ہم نے کہا ۔" کہاں ؟ "

کہنے لگے ۔" لاہور ، اور پرچہ نکالو ۔"

ہم نے کہا ۔" ایسا نہیں ہو سکتا ۔"

میاں صاحب کہنے لگے : " ہو کیوں نہیں سکتا ۔ مَیں نے ایک عارضی بندوبست کر لیا ہے ۔ ایک انگریز ملازم رکھ لیا ہے جو تمھیں اخبار کے متعلق فنی باتیں سمجھا دے گا ۔ بس خود ہی چلا لینا ۔ اور ہاں تمھیں پچیس سو روپے ملتے ہیں ۔ مَیں صرف ایک ہزار روپے ماہانہ دوں گا ۔ اور تمھیں لاہور رہنے کے لیے مکان بھی تو درکار ہو گا ، بھئی سردست باغبان پورہ میں ہماری حویلی ہے ، تم بچوں کو لے کے وہاں آجاؤ ۔"

مَیں نے کہا ۔" میاں صاحب فوج سے ریلیز کا مسئلہ ہے ۔ آپ لوٹے نہیں ہم نے Extention لے لی ہے ۔"

کہنے لگے ۔" اس کا بندوبست کرنا پڑے گا ۔"

" بندوبست ہو گیا ——— ہم بیوی بچوں کو دلّی چھوڑ کر ایک نئی منزل کی طرف جادہ پیما ہو گئے ۔ ———"

" پاکستان ٹائمز " کی ایڈیٹری فیض صاحب کے لیے اُن کی پبلک لائف کا آغاز تھی ۔

میاں صاحب کی حویلی ایک اچھا خاصہ کبوتر خانہ تھی ۔ بھلا ایک اعلیٰ فوجی افسر وہاں کیسے ٹِک سکتا تھا ۔

اور فیض صاحب کے اپنے ایک بیان کے مطابق . . . وہ گھر تو کب کا آثارِ قدیمہ میں شامل ہو جانا چاہئیے تھا۔ فیض صاحب ایک دوست کے فلیٹ میں رہنے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے خلیفتی میں ایک فلیٹ لے لیا اور باقاعدہ ایڈیٹری کرنے لگے۔

سنہ ۱۹۴۷ء کی باتیں یاد کر کے ایک دفعہ انھوں نے فرمایا:

"ہم دو رجے رات کے اخبار کے دفتر سے پیدل گھر جا رہے تھے۔ پیچھے ذرا سی سرسراہٹ ہوئی تو گمان ہوا کہ ہوا میں چاقو لہرایا۔ قدم تیز اٹھا دئے ہم اس بجا دوگر مصروف شب کی تنہا تاریکیوں میں اکیلے فلیٹ کی طرف رواں دواں تھے۔"

فوج کے سابق لیفٹیننٹ کرنل ہوا میں لہرائے ہوئے فرضی چاقو سے ڈر گئے۔ فوج کی نوکری انھیں اتنی راس آئی کہ "پاکستان ٹائمز" کے ایڈیٹر بننے کے بعد بھی کئی مہینے انگریزی وردی اور پستول پہنے رہتے تھے۔ ایک اطلاع کے مطابق سابق صدر پاکستان جنرل ایوب خاں فیض صاحب کے ساتھ فوج میں ہم رتبہ کام کر چکے ہیں۔ فوج کی نوکری میں فیض صاحب خوش تھے۔ اپنا فوجی وزیٹنگ کارڈ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ لندن اور دہلی میں جب بھی وہ پرانے انگریز افسروں سے ملنے جاتے تو لیفٹیننٹ کرنل فیض احمد فیض والا کارڈ آگے بڑھا دیا جاتا۔

ایک اور دلچسپ بات سنیے: ——

سنہ ۱۹۵۸ء کی جس سرد رات کو جنرل ایوب خاں نے پاکستان کی حکومت پر قبضہ کیا اس رات فیض تاشقند میں افرو ایشیائی ادیبوں کی دوسری کانفرنس میں اپنی دھواں دھار اینٹی امپیریلسٹ تقریر کرنے کے بعد محوِ ووڈکا تھے۔ فیض جب موڈ میں ہوتے ہیں تو "نقشِ فریادی" کو یاد کرتے ہیں۔ ویسے بھی پیدائشی عاشق ہیں۔ اردو شاعری میں اگر راج یوگ کسی نے پایا تو فیض نے —— ووڈکا سوڈے کے بغیر پیتے ہیں۔ عالمِ سرمستی میں کہہ گئے:

پیو کہ مُفت لگا دی ہے خونِ دل کی سبیل

کافی رات تک دَور چلتا رہا —— رات کو کسی نے بھی ایوب خاں والی خبر نہ سنائی۔ صبح ہوتے ہی جب یہ خبر اُن تک پہنچی تو فیض صاحب مس ریم تا کے ہاں بھیرویں کا سُن رہے تھے ——

فیض صاحب نے فوراً اسلام آباد جانے کا اعلان کر دیا ـــــــ رُوسی دوست کہتے رہے کہ فیض صاحب موقع کی نزاکت کو سمجھو۔ کچھ دن رُک جاؤ۔ وہاں مارشل لاء لگا ہوا ہے۔

فیض صاحب نے موقع کی نزاکت کو سمجھا اور اپنے رُوسی دوستوں کو بھی اس نزاکت سے آگاہ کیا اور اُسی دن لبستہ دن پاکستان پہنچے۔ ایر پورٹ پر گارڈ آف آنر کے سوا سب کچھ تھا ـــــــ سیدھے جیل پہنچے اپنے ہی شعر کی ترجمانی کرتے ہوئے:

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

مرے دِل، مرے مُسافر
ہُوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رُخ نگر نگر کا
کہ سُراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا

——— مرے دل مرے مسافر

باب : ثالث

غمِ جہاں کا حساب

فیض نے جب غمِ جہاں کا حساب شروع کیا تو ترازو مغرب کی طرف جھکنے لگا ۔ انگریزی ادبیات کا ایم ۔ اے ، وہ بھی گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی نا شتوں پر پلا ہوا نوجوان انگریزی فلموں کا شیدائی اور انگریزی ڈانس کا دلدادہ جب اُردو کی آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑا تو شہادت یقینی تھی لیکن غالب اور داغ کی زمینوں نے بچا لیا ۔ تنہائی ویرانیِ غم کے دُھندلکے ، پُرانی یادیں ، مشرق کی لن ترانیوں کو عبور کرتی ہوئی عشق کی ان وادیوں میں کھو گئیں جہاں فیض صرف اپنی اور اپنے مداحوں کی آواز سُن سکتے تھے ۔ جہاں فیض کے ابتدائی اشعار کی اور انگریزی کیٹس کے کئی اشعار سے ملتی ہے وہاں اس کی رُوح کی تنہائی اور اکتاہٹ شیلی اور ورڈز ورتھ سے اٹھکھیلیاں کرتی ہے ۔ گھنے درختوں پر سوئی ہوئی چاندنی کیٹس کی نظم La Belle Dame Sans Merci کی یاد دلاتی ہے ۔ کیٹس کی شاعری میں انسانیت کا رجحان حاوی تھا ۔ یہ رجحان وہ ہے جس سے کیٹس کی شناخت قائم ہوتی ہے ۔ فیض کی نظم " انتہائے کار " اور اسی ذیل کی دیگر نظموں میں انسانیت ہی نے فیض کی نظموں کے لہجے کو بڑا دل آویز بنا دیا ہے ۔

۱۵ اپریل ۱۹۸۱ئ میں شہر دلی میں جب کتھک کی مشہور ڈانسر اُوما شرما نے جشنِ فیض کے موقع پر فیض کی دو نظموں کو رقص کے دل فریب انداز میں پیش کیا تو فیض کی ستروں سالگرہ شائیسو بیا سا لگنے لگی ۔ دونوں نظمیں کیٹس کی حامی تھیں ۔

تنہائی، ورڈ ورتھ کی نظم SOLITUDE کے خصوصی انداز میں ہے "راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا" تنہائی کا ہر لمحہ بوجھل ہونا اسی نظم سے لیا گیا ہے۔ منٹو کے مرنے پر فیض نے جو چھٹی اپنی بیوی کو لکھی اس میں بھی کیٹس کا ذکر ہے۔ فیض کہتے ہیں کہ . . . منٹو کی طرح کیٹس نے بھی اپنے آپ کو مار رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کیٹس کی طرح فیض بھی شہید ہونا چاہتے تھے۔ لیکن مرنے کے لیے اس وقت کا ماحول خوش گوار نہیں تھا اور پھر پچیس سال کوئی عمر ہے مرنے کی۔ ہندوستان جیسے بوڑھے ملک میں پچیس سال کو تو بچپن کہتے ہیں۔

"تنہائی" پر صرف ورڈزورتھ کی ہی چھاپ نہیں ہے۔ آرتھر سائمن کی نظم بروکن ٹرسٹ (Broken Trust) اور ٹامس ہارڈی کی بروکن اپائنٹمنٹ ('Broken Appointment) کا بھی گہرا اثر ہے۔ جس طرح شیلی جھیل میں کاغذ کی ناؤ ڈالا کرتا تھا اسی طرح فیض کو بھی جھیل میں ناؤ بہت اچھی لگتی تھی۔ سائبیریا کی جھیل بکال کے کنارے بیٹھ کر فیض صاحب نے سینکڑوں کاغذ کی کشتیاں پانی میں چھوڑیں۔ سمندر کا سفر بھی، سمندر کی جھاگ بھی۔ شیلی تو پانی میں مرنے کی دعائیں مانگتا تھا۔ فیض صاحب کو لوگوں نے بمبئی کے سمندر میں گھنٹوں جھانکتے دیکھا ہے۔ ان کا انتظار اور تنہائی سمندر والی ہے۔ ہوائی جہاز کے دوروں سے پہلے وہ سمندر اور اس کے مدوجزر کے شیدائی تھے۔ پرانے رومن لوگوں کی طرح لیٹ کر کھانا کھاتے تھے۔ کیٹس کی طرح شیلی بھی فیض کی شاعری میں دبے پاؤں چلا آیا ہے۔

کیٹس کی طرح فیض گھوڑوں سے بھی پیار کرتے تھے۔ دھرم سالہ کے ٹٹوائیں بہت پسند تھے۔ فیض کے والد کو برٹش گورنمنٹ نے سرگودھا اور منٹگمری گھوڑوں کی افزائش نسل کے فارم الاٹ کیے تھے۔ کیٹس کے والد بھی مورفیلڈ (لندن) میں گھوڑوں کی دیکھ ریکھ کرتے تھے۔ ۱۸۵۴ء میں گھوڑے سے گر کر انتقال ہوگیا۔ کیٹس کا چھوٹا بھائی ٹامس بھی کچھ دنوں بعد تپ دق سے وفات پا گیا۔ جان کیٹس نے اپنے بھائی کی اتنی تیمار داری کی کہ خود دق کا مرض مول لے لیا۔ اسی دق نے کیٹس کی جان لی۔ کیٹس ایک دوا خانہ میں ملازم تھا، جہاں اس نے پانچ برس کام کیا۔ دق کے ساتھ کیٹس کی موت کا باعث ناکام محبت بھی تھی۔ ایک فینی نام کی لڑکی کے ساتھ۔ کیٹس روم کے قبرستان میں دفن ہے۔ اس کے مزار پر ایک عجیب کتبہ ہے:

"یہاں وہ شخص دفن ہے جس کا نام پانی پر لکھا گیا تھا۔"

فیض صاحب کی زندگی یا موت کسی بھی اوپر لکھے حادثے سے نہیں ٹکرائی۔ کیٹس کی ناکام محبت اور کیٹس کی شہرت کے المیے کی فیض صاحب سے کوئی نسبت نہیں۔ انگریزی ادب کے ناقدین کا خیال ہے کہ اگر کیٹس دو سال اور زندہ رہ جاتا تو انگریزی کے عظیم ترین شاعر شیکسپیر کو پیچھے چھوڑ جاتا۔ لیکن اگر فیض صاحب دو سال اور زندہ رہ جاتے تو یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کوئی ایسا مجموعہ دے جاتے،

جس سے اُردو شاعری کے در و دیوار ہل جاتے۔ فیض صاحب دراصل تھک چکے تھے۔ اپنی مادری زبان پنجابی میں لکھنے کے اعلان کے بعد وہ کچھ گھبرا سے گئے۔ دو چار غزلیں اور پانچ دس نظمیں انھوں نے پنجابی میں لکھ بھی دیں۔ لیکن بات کچھ بنی نہیں۔ پنجابی کی ڈگر کٹھن نکلی۔ اور وہ اُردو کی رومانی دنیا میں بحفاظت واپس لوٹ آئے۔

ڈاکٹر ابنِ فرید اپنے ایک مضمون "فیض بحیثیت رُومانی شاعر" (ہم اور ادب ۱۹۷۷ء) میں لکھتے ہیں:

> "فیض بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں انقلابی شاعر نہیں۔ انھوں نے اپنے لیے مقصد کا انتخاب ضرور کیا ہے لیکن نراجی سرشت یہاں بھی اپنی رنگ آمیزی سے عاجز نہیں رہتی چنانچہ اُن کا سیاسی مقصد ان کے لیے رومانی نصب العین بن جاتا ہے اور وہ ایک عینیت پسند شاعر کی طرح اس جارحیت میں بھی داخلیت پیدا کر لیتے ہیں۔ جہاں انھیں دردِ سیاں، غمِ جاوداں، صحرا نوردی، گوشۂ عافیت اور محزونی کے اظہار کا ایک مناسب وسیلہ ہاتھ آجاتا ہے۔"

فیض بنیادی طور پر رُومانی غزل کے شاعر تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> "غزل گوئی باریک کام ہے اور جو عیوب اور کمزوریاں دوسرے اصنافِ سخن میں دل و نظر گوارا کر لیتے ہیں، غزل میں نہایت زیادہ کھٹکتی ہیں۔ اسی سبب سے کامیاب غزل کے لیے اور اصنافِ سخن کے مقابلے میں عاشقی اور ہنرمندی کی زیادہ ہی مقدار چاہیے اور دورِ حاضر میں ان اجناس کی کچھ ایسی افراط نہیں۔"

فیض غزل کی باریکیوں کو سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ نظم کی ترقی کے باوجود غزل اردو شاعری کی جان ہے۔ لیکن اس جان کی رُوح کے لیے انھوں نے فارسی یا عربی سے کوئی انجکشن نہیں لیا ——— اُردو کو ہی اپنایا۔

مجروح سُلطان پوری نے فیض کو اُردو کی ترقی پسند شاعری کا میر کہا۔ اُن کا یہ کہنا ہے کہ فیض کی شاعری کا انداز، سوز و گداز میر والا ہی ہے۔ فیض ترقی پسند تحریک کے میر تھے یا امیر اس کا فیصلہ

اتنی جلدی کرنا ٹھیک نہیں ہوگا فیض کے مرنے سے پہلے بھی کئی نقادوں نے اس تحریک کو بے کفن لاش قرار دیا تھا۔ بہرحال فیض نے اس تحریک کی راہبری کی اس تیاگی ساربان کی طرح جو فکر تونسوی کے پیاز کے چھلکوں میں اکثر آتا ہے۔ جس کی بھیڑیں منڈی مشر کے طوطوں کی طرح شعر کہتی ہیں اور جانتی ہیں کہ شب غم بڑی بلا ہے۔ ساربان اپنے مسافر دل کو لے کر سر کوئے ناشناساں بستی بستی دوارے دوارے ہر اجنبی سے اپنے ہی گھر کا پتہ پوچھتا رہا۔ ویسے بھی سیالکوٹ میں اپنے کنک منڈی والے مکان کا راستہ رات کو فیض صاحب اکثر بھول جایا کرتے تھے۔

جان کیٹس اور فیض دونوں کو میلے بڑے پسند تھے۔ فیض ہر سال تقسیم تک وقت نکال کر چھبہ اور دھرم سالہ میں میلہ دیکھنے ضرور جاتے تھے۔ کیٹس تو میلوں کا یونانی حد تک پرستار تھا۔

فیض کے غیر اردو دوین پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے مضمون "فیض کی شاعری" (نقد فیض، مرتبہ نسیم عباسی) میں رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

"اُن کی ایک مشہور نظم ہے" دعا" اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

آئیے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنھیں رسم دعا یاد نہیں
ہم جنھیں سوز محبت کے سوا
کوئی بت کوئی خدا یاد نہیں

اُٹھان اچھی ہے۔ اس کے بعد کا بند ہے:

آئیے عرض گزاریں کہ نگار ہستی !
زہر امروز میں شیرینی فردا بھر دے !
وہ جنھیں تاب گراں باری ایام نہیں
انکی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے !
جنکی آنکھوں کو رخ صبح کا یارا بھی نہیں
انکی راتوں میں کوئی شمع منور کر دے
جنکے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
انکی نظروں پہ کوئی راہ اجاگر کر دے

غرض گزارد سے کچھ دیر کے لیے قطع نظر کر لیں تب بھی دوسرے مصرعے میں زہر میں شیرینی کا بھر دینا اُلجھن میں ڈال دے گا۔ زہر میں شیرینی نہیں بھری جاتی یہ مُہمل بات ہے۔ مفہوم قاعدے اور سلیقے کے ساتھ ادا نہیں ہو سکا۔ دوسرا شعر اِس سے کہیں زیادہ قابلِ اعتراض ہے۔ پلکوں پہ شب و روز کا ہلکا کرنا مفہوم سے عاری ہے اور یہ اُردو کا اندازِ بیان بھی نہیں۔ اس شعر میں گراں باری اور ہلکا کی رعایتِ لفظی کے سوا اور بھاری بھرکم لفظوں کے سوا اور کچھ نہیں اگر کچھ ہے تو غلط نگاری اور ژولیدہ بیانی ہے۔ یہی حال تیسرے شعر کا ہے "زخمِ صبح کا یارا" مناسب طرزِ کلام نہیں۔ اور "شمع منور کرنا" بھی خوب نہیں۔ شمع منور نہیں کی جاتی راتیں منور ہو سکتی ہیں۔ چوتھے شعر میں بھی اُردو پن مرحوم ہو کر رہ گیا ہے۔ نظروں پر راہ اُجاگر کرنا اُردو کا پیرایۂ اظہار نہیں۔ ترجمہ معلوم ہوتا ہے جو اُردو کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کرنا، قدموں پر راہ اُجاگر کرنا، شمع منور کرنا اور زہر میں شیرینی بھرنا اِن سب مُہملات نے پورے بند کو بے کیف اور بے رنگ بنا دیا ہے؟

رشید حسن خاں بخوبی جانتے ہیں کہ لفظ "یارا" اور لفظ "اُجاگر" دونوں پنجابی کے لفظ ہیں۔ اور پنجاب کے سنتوں نے دونوں لفظوں کا نہایت خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ بابا فرید اور گورو نانک نے "اُجاگر" کا عام استعمال کیا ہے اور بلھے شاہ اور وارث شاہ کے ہاں یاری اور یارا عام ملتا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ جب یہ دونوں الفاظ فیض کے ہتھے چڑھے تو ان کی خوبصورتی جاتی رہی — رشید حسن خاں کی مندرجہ بالا تنقید کا لب لباب یہی ہے کہ فیض صاحب کے ترجمے کمزور ہیں ورنہ ان کی شاعری میں نہ خوبصورت بندشوں کی کمی ہے۔ نہ حسین حروف کی اور نہ حسین پیکروں کی۔ اُن کی رومانی شاعری میں شرم و حیا بھی ہے اور پردہ داری بھی، لیکن جہاں ان کی شاعری نے سیاست کو ذرا چھوا تو بنتی ہوئی بات بگڑ گئی۔ گل و بلبل کی جگہ کلرکوں اور پوسٹ مینوں نے لے لی۔ نعرہ بازی ہونے لگی۔ اشتہار بٹنے لگے تقریریں ہونے لگیں۔ شاعری کی دھجیاں اُڑنے لگیں۔ اُن کی ادا ٹھہری۔ اب فیض صاحب سے کون پوچھے کہ آپ یہ سب کیوں کرتے ہیں — بھئی اچھا لگتا ہے۔ جب رضیہ سجاد ظہیر سے کسی نے پوچھا تھا کہ "آپ سگریٹ کیوں پیتی ہیں"، تو کہنے لگیں: یہ میں نہیں بتاؤں گی۔ میرا جی چاہتا ہے اس لیے پیتی ہوں، اچھا لگتا ہے — امرتا پریتم بھی یہی جواب دیتیں اور

ورجینیا ولف بھی۔

اصلیت یہ ہے کہ فیض صاحب پوری طرح سے فیصلہ نہ کر سکے کہ ان کی رومانی سیاست کے لیے غزل فٹ بیٹھے گی یا نظم ——— ایک سوال کے جواب میں انھوں نے پاکستانی جرنلسٹ شفیع عقیل کو بتایا:

"سوال یہ ہے کہ کوئی مضمون آتا ہی غزل کی صورت میں ہے یعنی غزل کا مسئلہ یہ ہے کہ کبھی اُستاد کا مصرعہ ذہن میں آگیا۔ غزل میں سہولت تو یہ ہے کہ آپ کو کوئی نیا نقشہ نہیں بنانا پڑتا۔ نقشہ پہلے سے موجود ہے۔ اگر زمین آپ کے ذہن میں آگئی اور معلوم ہوا کہ جو کچھ کہنا ہے وہ اسی صورت میں بہتر طریقے پر ادا ہو سکتا ہے۔ اس میں ایک آسانی یہ رہتی ہے کہ نقشہ موجود ہے۔ نظم کا تو یہ ہے کہ اس میں آپ کو خود بنانا پڑتا ہے کہ اس کا پیٹرن کیا ہے؟ اس کا نقشہ کیا بنانا ہے؟ تو بعض موضوعات ایسے ہوتے ہیں، ان میں پھیلاؤ اتنا ہوتا ہے کہ ان کو غزل میں سمیٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یا وہ آتا ہی اس صورت میں ہے کہ نظم کی صورت ہی میں ادا ہو سکتا ہے۔ تو ہم نے کبھی شعوری طور پر یہ اختیار نہیں کیا کہ آج غزل اور آج نظم لکھیں۔ وہ خود ہی آتا ہے۔ شعر جو ہے وہ اپنے پاؤں ساتھ ہی لے کر آتا ہے۔"

آنے والے کل کا شعر اپنے ساتھ اپنے پاؤں نہیں بلکہ پہیے لائے گا۔ شعر کمپیوٹر پر لکھے جائیں گے۔ پھر بھی یہ سوال اُٹھے گا کہ کیا وہ نثر میں ہوں گے یا نظم میں؟ نثری نظم میں یا پھر آزاد غزل میں۔ نثری نظم کے بارے میں فیض صاحب کا فیصلہ سنیے جو فتویٰ سے کم نہیں۔ فرماتے ہیں:

"اس میں بھی یہ ہے کہ لکھنے کی کوئی بات ہو، کوئی جذبہ ہو، اور وہ جو کچھ بھی آپ نے لکھا ہے وہ ٹھیک طریقے سے ادا ہو جائے تو وہ تو نظر آجاتا ہے۔ لیکن یہ نثری نظم کو ہم سمجھتے ہیں کہ یا نظم ہوتی ہے یا نثر ہوتی ہے یا وہ نظم ہوتی ہے۔ نظم میں جو ایک تلازمہ اس کا ہے کہ اس میں کوئی آہنگ، اس میں کوئی لحن، کوئی لے ہونی چاہیے۔ کوئی

ضروری نہیں کہ وہ عروض ہو۔ یہ ضروری نہیں جو ہمارے بندھے
ہوئے سانچے ہیں۔ وہی ہوں۔ اس میں ایجادات بھی ہوسکتی ہیں۔
اختراعات ہوسکتی ہیں۔ لیکن نالہ کو پابندِ نے کرنا ضروری ہے حیات
کی کوئی لے بھی ہو ——— لے کوئی بھی ہو لیکن وہ لے اس میں ہونی
چاہیے تاکہ نظر آئے کہ وہ نظم ہے نثر نہیں ہے۔ کیونکہ نثر بکھیرنے
کو کہتے ہیں اور نظم یکجا کرنے کو کہتے ہیں۔ تو نظم کے تو نام ہی سے
ظاہر ہے کہ اس کا کوئی قاعدہ قانون ہے۔ وہ قاعدہ آپ اپنا لیجئے
استادوں کو نہ مانیے لیکن قاعدہ تو ہونا ہی چاہیے۔"

اس کے باوجود فیض صاحب استادوں کو مانتے ہیں۔ غزلیں، نظمیں، نثر سبھی لکھیں۔ اپنے شاگردوں سے
انھیں بھی توقع تھی کہ انھیں استاد مانیں لیکن جب معشوقوں نے آپ کو بزرگ کہنا شروع کردیا تو بات کچھ بگڑ گئی
وہ لوگ جو موت کو زندگی کے لیے ڈھونڈتے رہے انھیں بھی ایک دن مرنا تھا۔ بجھتے چراغوں کے دھوئیں
سے آرتی اتارنے والے بیکار اپنی جان کو جلائے بیٹھے رہے۔ مرنے کے بعد ڈاکٹر بیماری کا سرٹیفکیٹ کیسے دے
سکتا ہے۔ اور پھر مرنا اپنے آپ میں کوئی بیماری نہیں اگر فیض کچھ اور سال زندہ رہتے تو ان سے اپنی شکست کا منظر
نہ دیکھا جاتا۔ چاند کے چہرے کے ساتھ آجکل آرم اسٹرانگ کے جوتوں کے نشان بھی تو نظر آتے ہیں۔ اگر نثری
نظم کو برداشت کیا ہے تو آزاد غزل کیوں نہیں؟
تنقید کے بارے میں بھی شروع سے ہی انھیں کئی شکوک تھے۔ فیض نے "ہماری تنقیدی اصطلاحات"
کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس کا آغاز ان فقروں سے ہوتا ہے:

"ایک تنقید نگار کو جہاں ہماری زبان سے اور بہت سی
شکایات ہیں وہاں ایک شکایت یہ بھی ہے کہ اسے حسبِ ضرورت
تنقیدی اصطلاحات نہیں ملتی۔ یہ زبان کے عجز پہ طعن نہیں
ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہماری زبان میں تنقیدی لغت
موجود ہی نہیں۔ یا اس میں ایسے الفاظ کی کمی ہے۔ جو مختلف تنقیدی
تصورات کو ادا کرسکیں، اس شکایت کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ ہمارے
ہاں تنقیدی الفاظ و تراکیب کے استعمال میں اختلاف اور ابہام موجود
ہے۔ ان کی اصطلاحی اہمیت زائل ہوگئی ہے . . . دوسری بات یہ ہے

کہ ان اصطلاحات کی فنی یا قدری اہمیت بہت واضح نہیں۔ ہم نے ابھی تک یہ پرکھنے کی کوشش نہیں کی کہ ہمارے مجوزہ محاسن و معائب، محاسن و معائب ہیں بھی یا نہیں اگر ہیں تو کیوں ہیں۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شاعر کے کلام میں سلاست ہے، روانی ہے خلوص ہے، جدت ہے وغیرہ وغیرہ تو نہ ہی اس شاعر کے کلام کی خصوصیات واضح ہوتی ہیں اور نہ اس کے کلام کے حسن و قبح کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے بعد بھی اگر ابن فرید یہ کہیں کہ فیض نے مشرق کی طرف پیٹھ کر کے مغرب کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تو آپ کیا کیجیے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ فیض نے عشق کو وسعت دی اور اسے یعنی عشق کو ایک نئے میدان میں لا کر کھڑا کر دیا جو سیاسی ہے۔

شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے تیرتے مرجھاتے رہے کھلتے رہے

—— فیض احمد فیض

باب : آٹھ

پچاس سال پہلے فیض صاحب نے اعلان کیا تھا کہ وہ اُردو شاعری کو عروض کے جھنجھٹ سے چھٹکارا دلانا چاہتے ہیں۔ نثری نظم کے لیے بھی ان کے پاس کوئی نرم گوشہ نہ تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جسے ہم نثری نظم کہتے ہیں، زیادہ سے زیادہ نظمیہ نثر ہے۔ ویسے بھی یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، ۱۹۲۶ء سے چلی آرہی ہے۔ "انشائے لطیف" کے نام سے یا پھر ٹیگور کے تتبع میں بنیادی فرق ہے نثر میں بکھرنے اور نظم میں یکجا کرنے کا ــــــــ فیض الف کے گرنے یا ب کے گرنے سے کبھی نہیں گھبرائے۔ وہ تو کہتے تھے کہ الفاظ میں لے پیدا کرو، معنی خود بخود آہنگ آمیز ہو جائیں گے۔ آج سے چھیالیس سال پہلے فیض صاحب نے اپنے مضمون میں ایک سوال اُٹھایا تھا کہ شعر کی ادبی قیمت کامیاب اظہار پر منحصر ہے یا کامیاب ترجمانی پر۔ وہ لوگ جو اظہار ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں کہتے ہیں کہ شاعر کو اگر کسی غیر آباد جزیرے میں بھی تنہا چھوڑ دیا جائے تو وہ شاعری کی حرکت سے پھر بھی باز نہیں آئے گا لیکن ایسے جزیرے میں پڑھنے سننے والے کا وجود ہونا ضروری ہے۔ شاعری میں اکثر اصناف ایسے ہیں جن میں روئے سخن ہوتا ہی کسی سننے والے کی جانب ہے اور بعض نظمیں لکھی ہی اس لیے جاتی ہیں کہ اوروں کو سنائی جائیں شاعری پر کبھی قدغن تو لگائی نہیں جا سکتی۔

اس ضمن میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے فیض صاحب لکھتے ہیں :

"اس کا ہم یہ جواب دیں گے کہ اگر شاعر ہمیں شعر سناتا ہے تو اسے ہم اپنے ہی معیار سے جانچیں گے۔ اگر اسے یہ معیار پسند نہیں تو اپنے شعر اپنے پاس رکھے اور بڑی خوشی سے پڑیاں باندھ کر ان میں ہاضمے کا چورن بیچا کرے ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ ہمارا مغز چاٹے گا تو ہم اس سے معاوضہ بھی طلب کریں گے اور وہ یہی ہے کہ شعر کے تصور اور تخلیق میں جو راحت اس نے محسوس کی ہے اس میں ہمیں بھی شریک کرے۔ اس نے جو کچھ دیکھا ہے ہمیں دکھائے۔ اور جو کچھ سنا ہے سنائے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ تنقید کے اصول ہمیشہ پڑھنے والے وضع کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کے نزدیک شعر کی پہلی خوبی یہ ہے کہ شعر کا مضمون ان تک زیادہ سے زیادہ مؤثر طریقے سے پہنچے۔ پہلی خوبی اس لیے کہ جب ہم شعر کو سمجھیں گے نہیں شعر کی باقی خوبیاں ہمیں نظر ہی نہیں آئیں گی۔ شاعر کے تجربے میں کتنی وسعت اور کتنی گہرائی کیوں نہ ہو اگر ہم واجبی کوشش کے باوجود اس تجربے کو ذہن میں نہ لا سکے تو شعر کو لازماً کامیاب نہیں ٹھہرائیں گے۔ ہم یہی کہیں گے کہ اول تو اس مضمون میں وسعت نہیں ہے اور اگر ہے تو فی بطن شاعر ہے ——— فی بطن شعر نہیں غالباً دنیا کا کوئی شعر بالکل مہمل اور بے معنی نہیں ہوتا کیوں کہ شعر لکھتے وقت شاعر کے ذہن میں کوئی نہ کوئی خیال تو ہوتا ہے لیکن ہم اس شعر کو مہمل کہنے میں حق بجانب ہیں جس میں یہ خیال تک نہ پہنچے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ شعر جو فوراً ذہن میں آ جائے اچھا ہے اور ہر وہ شعر جو ذہن میں نہ آئے برا ہے۔ اگر شعر فوراً ذہن میں آ جائے تو یہ ایک خوبی ضرور ہے لیکن بہت ممکن ہے کہ شعر میں اور بہت سی برائیاں ہوں جو کہ اس خوبی کو رد کر دیں یا شعر کا مضمون اتنا پامال ہو کہ اس پر توجہ دینے کی ضرورت نہ پڑے۔ اسی طرح اگر شعر فوراً ذہن میں نہ آئے تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاعر نے شعر میں اتنے تصورات یکجا کر دیے ہیں کہ ان کا ایکدم ذہن میں آ جانا مشکل ہے۔ اس صورت میں ہم شعر پر جتنا زیادہ غور کریں گے

اُتنی قدر اُس سے لطف اندوز ہوں گے اور ہمیں اس میں برابر کوئی نئی خوبصورتی نظر آئے گی۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ شعر کی کامیابی اظہار پر نہیں ترجمانی پہ منحصر ہے۔ ہم کسی اظہار کو اُس وقت تک کامیاب نہیں کہہ سکتے جب تک وہ دوسروں کے لیے ترجمانی کا حق ادا نہ کرے۔

یہاں ایک اور دقت پیش آتی ہے۔ شاعر کا کلام باقی رہتا ہے لیکن اس کے پڑھنے والے بدلتے رہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ شاعر کا کلام اس کے عہد کے لوگ نہ سمجھیں لیکن بعد میں آنے والی نسلیں اسی کے کلام کو شاعری کا معراج قرار دیں یا کوئی شاعر اپنے عہد میں آسان لیکن آئندہ زمانے میں ناقابلِ فہم ہو جائے۔ غالب ہی کو لیجیے۔ غالب کو ہم بہت بڑا شاعر مانتے ہیں لیکن سنا ہے کہ غالب کے اپنے زمانے میں اس کا کوئی چرچا نہ تھا اور لوگ اُسے مہمل گو کہتے تھے۔ اگر شاعر کا مقصد ترجمانی یا اپنے مضمون کو دوسروں تک پہنچانا ہے تو وہ لوگ بھی سچے تھے اور ہم بھی سچے ہیں۔ اور اس طرح ترجمانی کا کوئی قطعی معیار تو نہ رہا۔ اس کا جواب کئی طریقوں سے دیا جا سکتا ہے۔ اول تو یہ بات ہی غلط کہ غالب کے زمانے میں اس طرح کے قدردان نہیں تھے۔ غالب کو سراہنے والوں کی اس زمانے میں بھی کوئی کمی نہ تھی اور غالب کو کوسنے والے آج بھی موجود ہیں۔ غالب سے لوگوں کو اختلاف اس کے مضامین کی وجہ سے نہیں اس کے لفظیہ شاعری کی وجہ سے تھا۔ آخر ناسخ کی بھی تو قدر ہوئی اور اُستاد ذوق کا کلام بھی تو زیادہ سلیس نہیں۔ معاملہ اصل میں یہ تھا کہ لوگ لفظی صنعتوں کو کمال شاعری سمجھتے تھے۔ لیکن غالب اس راستے سے ہٹ کر خاص جذبات کی مصوری کرنا چاہتے تھے۔ بعض اشخاص کو یہ چیز عجوبہ سی معلوم ہوئی اور وہ اس کی فنی اہمیت کا اندازہ نہ کر سکے۔ دوسری بات یہ کہ آج کل بھی غالب کی عظمت اس کے سلیس اشعار کی وجہ سے قائم ہے نہ کہ مشکل اشعار کی وجہ سے۔ اب بھی غالب کے بعض اشعار ہمیں اتنے ہی مہمل معلوم ہوتے ہیں جتنی کہ ڈاکٹر ٹیگور کی تصویریں۔ پڑھنے والے بدلتے رہتے ہیں لیکن زندگی کے بنیادی تجربات اور جذبات نہیں

بدل جاتے ۔ اگر شاعر نے ان کی کامیاب ترجمانی کی ہے تو ان اشعار کی قیمت وقت
اور مقام کی پابند نہیں، اگر یہ سب دلیلیں رد کر دی جائیں تو بھی ہم یہی
کہیں گے کہ اگر غالب کو اس عہد میں داد نہیں ملی تو اس وجہ سے کہ
لوگ اس کے اشعار سمجھ نہیں سکے، اور ہم اسے داد دیتے ہیں تو اس وجہ
سے کہ اس کے اشعار سمجھ سکتے ہیں ۔ معیار پھر بھی رہا ایک ہی ۔ اگر یہ اس کے
دائرے اور وسعت میں تبدیلی واقع ہو گئی اس لیے ایک اچھے شعر یا اچھی
نظم کی کامیابی یہی ہے کہ اس کا مضمون پڑھنے والوں تک سہولت اور
برجستگی سے پہنچے تاکہ وہ اسے سمجھ سکیں، اس سے متاثر ہو سکیں اور اپنے
تاثر کو داد کی صورت میں شاعر تک پہنچائیں ۔"

میں نے یہ لمبا چوڑا بیان (لمبا زیادہ چوڑا کم) فیض کے ایک مضمون سے جو "ادبی دنیا کراچی" میں چھپا ہے،
اس لیے اخذ کیا ہے کہ فیض صاحب کے نظریۂ فن کو سمجھنے میں آسانی رہے ۔ اور ساتھ ساتھ اس بات کی قلعی
کھل جائے کہ ان کے پاس کون سا کلوروفارم تھا کہ جس محفل میں گئے ساری محفل کو بے ہوش کر آئے ۔ اس سوال کا جواب
دیتے ہوئے پروفیسر ممتاز حسین لکھتے ہیں :

"فیض جب بھی محفل میں آئے تو ایک چھوٹی سی کتاب ایک قطعہ
غزل کے چند نامکمل اشعار کچھ یونہی مشق سخن اور کچھ معذرت کی
باتیں لے کر آئے لیکن ہر بار کامیاب آئے ۔ دوست دشمن سبھی نے سراہا یا
یار دوستوں میں چرچا ہوا ۔ کچھ لوگوں نے کتاب پٹک دی اس میں رکھا ہی
کیا ہے ۔ اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے چراغ، ان گنت صدیوں
کے تاریک بہیمانہ طلسم، لیکن جب کسی نازک سی کسک نے چٹکی لی،
دل کی سنعتیں فروزاں ہوئیں وہی فیض کو گنگنانے بھی لگے ۔ پھر کوئی آیا
دل زار نہیں، کوئی نہیں ۔ آؤ کہ مرگ سوز محبت منائیں ہم ۔ اپنے اجداد
کی میراث ہے معذور ہیں ہم ۔ چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی ۔
عجب ملے جلے سے خیالات میں کبھی ایسی شگفتگی اور شادابی جو سودا کو
بھی حاصل نہ ہوئی اور کبھی ایسی افسردگی کہ غالب کو بھی رشک آ جائے ۔
یہ ہیں یہ امید کا یہ عالم کہ سیہ ترین رات کا سینہ بھی منور ہو جائے ۔

ان ساری چیزوں کو گھلا ملا کر وہ کیوں کر اپنے فن میں پیش کرتے ہیں ان کو سمجھنے کے لیے ان کے فن کی چند خصوصیات پر غور کرنے کی ضرورت ہے:

فیض کے فن اور فارم کی خصوصیات کو اگر غور سے دیکھا جائے ان کے الفاظ کی داخلی اور خارجی موسیقی کا تنقیدی جائزہ لیا جائے ان کے غزل اور نظم کی ڈکشن کو علٰحدہ علٰحدہ تولا جائے تو فیصلہ خود بخود بولے گا کہ ان کی نظمیں ان کی غزلوں پر بھاری ہیں۔ جیل میں نظم نہیں لکھی جا سکتی۔ حالانکہ فیض صاحب نے غزل کو نظم کے ساتھ ساتھ چلانے کی پوری کوشش کی ہے۔ ان کے ہر نئے مجموعے پر ان کے ناقدین نے کہا کہ جو بات ان کے اس سے پہلے مجموعے میں تھی وہ اب نہیں رہی۔ کہتے ہیں جب کسی نے فیض صاحب کے پیشے کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ ان کا پیشہ زمین داری ہے۔ اور چونکہ ہر بڑے زمین دار کا دوسرا پیشہ سیاست ہے فیض صاحب نے سیاسی شاعری شروع کر دی۔ زمینداری ان کی سیالکوٹ میں تھی اور سیاست روس میں۔ پہلا عشق دھرم سالہ میں ہوا دوسرا عشق مسلسل جو بقول شاعر:

عشق سے کیا میر اتنی گفت گو
خاک اڑا دی عشق نے ہر چار سو

کئی سال پہلے میں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ اردو کے عشقیہ شعراء نے دراصل عشق کیا نہیں صرف اس کا تصور کیا ہے۔ اسی لیے فیض کی کئی غزلیں مہدی حسن اور نور جہاں کے نام سے مشہور ہیں۔ میرے ایک دوست ہیں جنھوں نے غزلیں لکھنی بند کر دیں۔ میرے پوچھنے پر بولے۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔ شانِ غزل یہ تھی کہ جب مریض نے اپنا علاج دوسرے ڈاکٹر سے کروانا شروع کیا تو اس کے مشورے پر غزل پھر لکھنا شروع کر دی۔ کچھ نقادوں کا الزام ہے کہ فیض صاحب نے شعر نہیں کہے بلکہ اپنی چوماچاٹی کہہ لیا کرتے تھے۔ یہ تو وہی جواب ہوا جو میر نے جرأت کو دیا تھا۔ کہتے ہیں جب قمر الدین منت میر کے پاس اصلاح کے لیے اردو غزل لے گئے تو میر صاحب نے وطن پوچھا۔ انھوں نے سونی پت علاقہ کو پانی پت بتلایا۔ کہنے لگے اردو خاص دلی کی زبان ہے آپ اس میں تکلیف نہ کیجیے اپنی فارسی وارسی کہہ لیا کیجیے۔ اگر میر زندہ ہوتے اور فیض اسی طرح میر کے پاس جاتے اور اپنا وطن کالا قادر علاقہ سیالکوٹ بتاتے تو ان کو بھی وہ شاید یہی مشورہ دیتے کہ اردو میں تکلیف نہ کیجیے عربی وربی میں کہہ لیا کیجیے۔ اور پھر عربی میں تو آپ ایم اے بھی ہیں۔ دلی والے بڑے ضدی ہیں دیکھو ذوق کی قبر کہاں سے نکال لائے۔ لکھنؤ اپنی نزاکت میں مارا گیا۔ میر کی قبر کا کوئی اتہ پتہ نہیں ہے۔ سیالکوٹی اپنی قبر سیالکوٹ میں بنواتے ہی نہیں۔ علامہ اقبال

کا مزار لاہور میں ہے اور فیض صاحب کا اسلام آباد میں ــــــ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اردو کے ایک پروفیسر نے اپنی قبر یونیورسٹی والے مکان میں کھدوانے کا اعلان کیا۔ بعد میں منہ کی کھائی۔
فیض صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ سیالکوٹ سارے پاکستان میں سب سے پسماندہ ضلع ہے۔ پورا بیان قابلِ ذکر ہے:

"ہمارا جو گاؤں ہے۔ اس سارے علاقے میں نہ صرف سڑک اور نہ دوسری سہولتیں اگر اس گاؤں والے چاہتے تو ان بڑے بڑے لوگوں کا گھیراؤ کرتے یا ان سے استدعا کرتے کہ اس علاقے کے لیے کچھ کردو۔ اب تھوڑی دیر کے لیے سابقہ دورِ حکومت میں حنیف رامے جب وزیرِ اعلیٰ تھے تو میں نے ان سے کہا کہ ہماری سڑک تو بنوا دو۔ اب یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ سڑک بن گئی۔ پھر یوسف خٹک صاحب سے کہا کہ بجلی لگوا دو، انھوں نے بجلی لگوا دی۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ یہ سب کچھ میں کرتا کوئی اجتماعی ادارہ ایسا کرتا تو زیادہ بہتر تھا جو سڑک کو نسلیں وغیرہ میں ان کا کام کیا ہے۔ باقی ملک کو چھوڑ دیں آپ کوئی ایک گاؤں یا قصبہ بغیر امریکن امداد کے حل کرلیں تو وہی بہت ہے۔ بنیادی ضروریات جو ہیں ان کے لیے کوئی بڑا منصوبہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے ہاں یہ جو پانچ سالہ منصوبے اور دوسرے منصوبے میں ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ منصوبے کتنے سالوں سے بن رہے ہیں لیکن حالات وہیں کے وہیں ہیں۔"

اب ذرا فیض صاحب کے انقلاب کی بات بھی ہو جائے ویسے انقلاب اور سازش دو الگ لفظ ہیں۔ فیض صاحب راولپنڈی سازش کیس میں ملوث ہونے کے باوجود پاکستانی سیاست میں کوئی انقلاب نہ لا سکے۔ لیکن اس کا یہ فائدہ تو ہوا کہ راتوں رات ان کی شہرت بامِ عروج پر پہنچ گئی۔ اور ان کے متعلق کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ آخر ان واقعات کے پسِ پردہ کون سے حقائق کام کر رہے ہیں اور فیض صاحب کا راولپنڈی سازش میں بذاتِ خود کتنا ہاتھ ہے۔ جب تک اس سازش کا پورا منظر نامہ سامنے نہیں آ جاتا فیض صاحب کو انقلابی کہنا ایک طرح سے ان پر تہمت دھرنے کے مترادف ہے۔

سیاست میں ان کے عمل سے مایوس ہونے کے بعد اب یہ دیکھا جائے کہ وہ ادب میں بھی کسی انقلابی دستور کے نقیب ثابت ہوئے ہیں یا نہیں اور انھوں نے ادب کو کن انقلابی قدروں سے روشناس کرایا ہے تو مجھے یہاں یہ کہتے ہوئے بڑا افسوس ہوتا ہے کہ یہ سرزمیں بھی انقلابی عناصر سے عاری ہے۔

فیض کے مقلدین فیض کو اکثر انقلابی شاعر کا خطاب دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ گویا انھوں نے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہے لیکن یہ ان کی کوتاہ بینی کی دلیل ہے۔ انقلاب کوئی گھر کی لونڈی یا باندی نہیں جسے جب چاہا کسی کی خدمت پر مامور کر دیا اور سمجھ لیا کہ حقِ مہمان نوازی ادا ہو گیا۔

جس قسم کی شاعری فیض صاحب کرتے رہے ہیں اگر اسی کا نام انقلابی شاعری ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اختر شیرانی ان سے کہیں بڑا انقلابی شاعر ہے۔ جوش بے چارے کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔

فیض صاحب کے تعلق سے یہ بات بھی سننے میں آتی ہے کہ انھوں نے رومان اور انقلاب کا معانقہ کچھ اس فنی چابک دستی کے ساتھ کرایا ہے کہ اردو شاعری میں اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

دراصل اس قسم کی باتیں ان لوگوں نے زیادہ کہی ہیں جو انقلاب کے تعلق سے کچھ زیادہ ہی خوش فہمی میں مبتلا ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ انقلاب اب آیا اور اب آیا۔

فیض کی زندگی کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ وہ معاشرے کے کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں تو یہ بات آسانی سے واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا انقلابی تصور محض ایک پرچھائیں ہے۔ فیض صاحب ابتدا ہی سے رومانی مزاج رکھتے تھے اور جس عہد میں انھوں نے ہوش سنبھالا، اور جس تحریک سے انھوں نے کسب کیا وہاں انقلاب کے نام پر سوائے خود فریبی کے اور کیا حاصل ہو سکتا تھا۔

اگر فیض صاحب کی ابتدائی شاعری پر نظر ڈالیں تو محسوس ہوگا کہ یہ کسی باغی یا انقلابی کی شاعری نہیں ہے بلکہ ایک ایسے نوخیز لڑکے کی شاعری ہے جس نے ابھی بلوغت کے مراحل طے نہیں کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ابتدائی شاعری کا لب و لہجہ نسائیت آمیز ہے۔ اسی لیے اس میں گھن گرج کی بجائے مسکینیت اور خود ترحمی کے عناصر وافر مقدار میں ہیں۔

آیئے اس سلسلے میں عہدِ حاضر کے ایک نقاد سے بھی رجوع کریں اور دیکھیں کہ فیض صاحب کی شاعری کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے۔

ڈاکٹر عتیق اللہ "تنقید کا نیا محاورہ" میں فیض کی ابتدائی شاعری کا اس طرح تجزیہ کرتے ہیں:

> "فیض اپنے پہلے دور کی شاعری میں ایک ایسے رومانوی ہیں جو اپنی ذات میں تنہا اور خود کوش رہے، جو بلوغت کی حدوں سے دور رہے، معمولی معمولی جذباتی صدموں سے

ھلکان ہو جاتا ہے۔ جس میں نسائیت سے مملو خود رحمی ہے
اپنی توفیق میں محدود، اقرار ہی اقرار ـــــــ انکار کی استطاعت
سے محروم۔"

یہاں پر "پہلے دور کی شاعری" خاص طور پر توجہ کی مستحق ہے۔ کیونکہ انجام کی بخیر و عافیت تکمیل کے لیے اس کے آغاز کا جاننا نہایت ضروری ہے اور یوں بھی مثل مشہور ہے کہ "پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں۔"

سو فیض صاحب کی ابتدائی شاعری کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ابتدا میں ان کا انقلابی تصور خام تھا جیسا کہ آجکل یہ عام روش چل پڑی ہے کہ ترقی پسندوں کے ابتدائی جذباتی اور ناپختہ خیالوں پر یہ کہہ کر پردہ ڈال دیا جاتا ہے کہ ابتدا میں مارکس کے انقلابی تصور سے وہ پوری طرح آگاہ نہیں تھے وغیرہ وغیرہ۔ اب ذرا فیض صاحب کے چند اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں :

بات بس سے نکل چلی ہے
دل کی حالت سنبھل چلی ہے
جاؤ اب سو رہو ستارو
درد کی رات ڈھل چلی ہے

نہ آج لطف کر اتنا کہ کل گزر نہ سکے
وہ رات جو کہ تیرے گیسوؤں کی رات نہیں
یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے
مقامِ فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

سُوئے دار کی بات تو فیض ایسے کرتے ہیں جیسے کہ وہ خالہ جی کا گھر ہے کہ بس ابھی گیا اور ابھی آیا۔ غالباً اس قبیل کے اشعار سے یار لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ فیض صاحب کوئی بہت بڑا انقلاب لانا چاہتے ہیں اور فیض نے بھی اپنے مداحوں کو مغالطے میں رکھنے کے لیے لفظ ' دار' کا خوب استعمال کیا ہے: شاید "دار" ان کے نزدیک دارو کا درجہ رکھتی ہے۔

اب فیض صاحب کی ایک نظم کا بند ملاحظہ ہو:

قسم تمھاری بہت غم اُٹھا چکا ہوں میں
غلط تھا دعوئ صبر و شکیب آ جاؤ!
قرارِ خاطرِ بے تاب تھک گیا ہوں میں

اس بند کے بارے میں میں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ اس میں جو نسائی چونچلے بیان کیے گئے ہیں ان کو تحریر کرتے ہوئے بھی عجیب شرمندگی کا احساس ہوتا ہے۔ البتہ ڈاکٹر عتیق اللہ نے جس طرح اس کی تعبیر پیش کی ہے وہ ضرور بیان کے لائق ہے۔ ڈاکٹر موصوف فرماتے ہیں:

"یہ قسمیں، یہ صبر و شکیب کے دعووں کو غلط بتلانا، یہ تھکان، یہ عجز، جذبوں کی یہ اوّلین اور اضطراری گفتار اپنے آپ میں نسائی ہے۔ شاعر ابھی عنفوانِ شباب کے مرحلے میں ہے۔"

ترقی پسندوں کا شاعری کے تعلق سے یہ رویہ کتنا عجیب ہے کہ جن شعرائے کرام نے شاعری کو انقلابی لب و لہجہ کا خوگر بنایا اور اپنے اجتہادی تصورات سے شاعری میں ایک نئی روح پھونکی انھیں کو نظر انداز کیا یا پھر ان کے لب و لہجہ کو خطیبانہ کہہ کر ان سے رو گردانی برتی۔ مثلاً جوش، احسان اور مخدوم وغیرہ۔

جوش کے لیے تو یہ تک کہا گیا ہے کہ وہ شاعری میں لفظوں کا اکہرا استعمال کرتے ہیں یا بالفاظِ دیگر ان کے یہاں محض لفظوں کی گھن گرج کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جبکہ جوش کے برعکس احسان دانش کو تو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا۔ حالانکہ فیض کے مقابل اول الذکر شعرا کے یہاں انقلابی رُوح اپنی پوری توانائی کے ساتھ اُبھر آئی ہے۔ اور خاص کر جوش نے تو انقلاب کے تصور کو اپنی شاعری کے ذریعہ دو آتشہ کر دیا ہے۔

کم از کم جوش کی شاعری کو پڑھ کر قاری پر غنودگی تو طاری نہیں ہوتی، رگوں میں دوڑتا ہوا خون منجمد تو نہیں ہوتا جبکہ فیض صاحب اپنے رویے سے خون کو گرمانا تو ایک طرف رہا، انتہائی خوف زدہ اور مایوس

کر دیتے ہیں۔

فیض صاحب یہی نہیں کہ لب ولہجے کے اعتبار سے کوئی بہت بڑی کارکردگی نہیں دکھا سکے بلکہ نظم کے مروجہ ڈھانچے میں بھی کسی تبدیلی کو راہ نہیں دے پائے جبکہ ان ہی کے معاصرین میں میراجی اور راشد نے نظم کے فرسودہ ڈھانچے کو ہی بدل کر رکھ دیا۔ فیض صاحب جیسے محتاط، رُک رُک کر اور سنبھل سنبھل کر چلنے والے شاعر سے ایسے کسی خوش آئند تجربے کی توقع بھی فضول ہی ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں فیض صاحب بنیادی طور پر ایک روایتی شاعر ہیں اور عمر بھر روایتی قدروں سے چمٹے رہنے کی وجہ سے کبھی بھی ان کے یہاں ولولہ انگیز عناصر نے جلوہ گری نہیں دکھائی:

جب تجھے یاد کر لیا صبح مہک مہک اُٹھی
جب تیرا غم جگا لیا رات مچل مچل گئی

نہ جانے کس لیے اُمیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں
ایک بار اور مسیحائے دلِ دل زدگاں
کوئی وعدہ کوئی اقرار مسیحائی کا
اور کچھ دیر نہ گزرے شبِ فرقت سے کہو
دل بھی کم دُکھتا ہے وہ یاد بھی کم آتے ہیں

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے

ان تمام اشعار کو پڑھ جائیے اور پھر کہیے کہ کیا ان میں زنانہ چونچلوں کے علاوہ بھی اور کچھ نظر آتا ہے۔ ممکن ہے آخری شعر میں دار و رسن کا ذکر آپ کو کسی غلط فہمی کا شکار کر دے اور آپ فیض صاحب کے تعلق سے کسی گمراہ کن خیال میں مبتلا ہو جائیں مگر آپ ذرا دار و رسن سے ہٹ کر اس شعر کی مدھم اور برف آمیز لے پر بھی دھیان دیں۔ کیا دار و رسن کی باتیں اسی انداز میں ہوتی ہیں جس طرح فیض کر رہے ہیں۔ ممکن ہے یہاں آپ مجھ پر فیض کے تعلق سے انتہا پسندی کا الزام عائد کریں اور ہو سکتا ہے اس میں آپ کسی حد تک حق بجانب ہوں۔ کیونکہ انقلاب محض نعرہ بازی کا تو نام نہیں۔

مگر ہم شاعر سے اتنی توقع تو رکھ سکتے ہیں کہ جن موضوع کو وہ برت رہا ہے اسی کے شایانِ شان الفاظ اور لہجے کا بھی استعمال کرے ورنہ پھر اس طرح تو اردو کا ہر ایرہ غیرہ نتھو خیرہ انقلابی شاعر ٹھہرے گا۔

جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں راولپنڈی سازش کیس میں ملوث ہونے کے بعد اور جیل کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد فیض صاحب کے عزم و حوصلے کی ساری عمارت ہی ڈھہ گئی اور وہ اس قابل نہیں رہے کہ مردانہ وار حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ بعض اوقات ان کے بیانات اور شاعری پڑھ کر یہ تو محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان سے کوئی بہت بڑا جرم سرزد ہو گیا ہے اور جس کا احساس انھیں اندر ہی اندر کچھوکے لگا رہا ہے۔ شاعری میں بھی ان کی یہ حد سے زیادہ خوابناک لے غالباً اسی احساسِ جرم کی غمازی کرتی ہے۔ ورنہ سوچنے کا مقام یہ ہے کہ کہیں تو ان کے لہجے میں چمک آتی، کہیں تو ان کی شاعری سے وقار کا احساس ہوتا۔ شروع سے آخر تک ان کے شعری مجموعوں کو پڑھ جائیے۔ وہی یکسانیت، وہی دھیما پن، وہی ٹھہری ٹھہری لے، وہی زنانہ قسم کے مسائل۔ بلاشبہ ان میں سے بعض اشعار اچھے بھی مل جائیں گے مگر یہاں ذکر اچھے یا بُرے اشعار کا نہیں ہے۔ یہاں تو معاملہ صرف یہ ہے کہ فیض صاحب نے اپنی شاعری کے ذریعہ کون سے انقلاب کے لیے راہ ہموار کی۔ اور کیا انقلاب آمیز شاعری اس غنودگی کے ساتھ کی جاتی ہے:

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم بے حساب یاد آئے!

وہ بات سارے فسانے میں جن کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

ایک ایک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

غمِ جہاں ہو غمِ یار ہو کہ تیرِ ستم
جو آئے، آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

سُولیوں پہ ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی

تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی
جب گھُلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل دل میں قندیلِ غم

حقیقت تو یہ ہے کہ فیض صاحب نے اپنے لیے جو راستہ ابتدا میں اختیار کیا تھا وہ آخر تک اس پر آنکھ بند کیے ہوئے چلتے رہے۔ انھوں نے آنکھ کھول کر ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں دیکھا کہ ان کے گرد و پیش کیا کچھ تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں۔ جہاں تک سیاسی آگہی کا سوال ہے تو ان سے کہیں درجہ زیادہ سیاسی بصیرت ن۔م۔ راشد میں تھی۔ راشد کی شاعری میں تمام ایشیا کی رُوح سمٹ کر آ گئی ہے۔ انقلابی شاعری کے تقاضوں پر فیض سے زیادہ راشد پورے اُترتے ہیں۔ آخر میں صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ فیض صرف ایک رومانی اور روایت پسند شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی محدود بساط میں نوجوانوں کے عشقیہ جذبات کو تسکین ضرور بہم پہنچائی اور اس لیے وہ سنجیدہ فکر رکھنے والوں سے زیادہ لااُبالی طبیعت رکھنے والے نوجوانوں کو زیادہ عزیز رہے۔ تبھی تو غلام علی اور مہدی حسن کے وارے نیارے ہو گئے۔

فیض جب بھی بزم میں آئے ادبی مُلّاؤں کو جھاڑ کے چلے گئے۔ سیاسی لیڈروں کو تاڑ گئے۔ اور پھر جب "کالا علم" بھی ازبر کر لیا تو جس بزم میں گئے سکندرِ اعظم کی مانند۔ آندھی کی طرح آئے اور بگولے کی طرح چلے گئے۔ طبع سلیم سے عاری اُس قاضی کی طرح نہیں جو عملی سیاست میں ہونے کے باوجود دلّی کی ادبی سیاست کے دھوبیوں کا گدھا بن کر نہ گھر کا رہا اور نہ گھاٹ کا۔ نجات کا راستہ شراب کی بوتلوں سے تو نہیں گزرتا۔

∞

قطعہ

مقتل میں نہ مسجد نہ خرابات میں کوئی
ہم جس کی امانت ہیں غمِ کارِ جہاں دیں
شاید کوئی ان میں سے کفن پھاڑ کے نکلے
اب جائیں شہیدوں کے مزاروں پہ اذاں دیں

——— فیض

باب : نو

راستے والا گھر

فیض منٹو سے صرف ایک سال تین مہینے بڑے تھے۔ لیکن نہایت فخر سے کہا کرتے تھے کہ منٹو اُن کا شاگرد ہے۔ امرتسر کے کٹڑوں اور گلی کوچوں کا اکثر ذکر کرتے تھے۔ جلیانوالہ باغ اور بھگت سنگھ کی باتیں بھی ہوتیں۔ ان محفلوں کا ذکر آتا جن میں منٹو بھی آتا تھا۔ 'ٹھنڈا گوشت' پر جب اعتراض ہوا تو فیض "پاکستان ٹائمز" کے ایڈیٹر اور پریس ایڈوائزری بورڈ کے کنوینر تھے۔ معاملہ جب ان کے سامنے آیا تو فیض بہت پریشان ہوئے۔ گو وہ منٹو کو فحاشی کے الزام سے بری تو نہ کروا سکے لیکن منٹو سے ان کو خاص لگاؤ تھا۔ منٹو کے بعد وہ تقریباً تیس سال زندہ رہے لیکن منٹو ان کو کبھی نہیں بھولا تھا۔ منٹو کی اچانک موت پر اپنی بیوی ایلیس فیض کو لکھی ہوئی چٹھی سے ان کی منٹو نوازیاں نمایاں ہیں۔ ملاحظہ ہو، یہ چٹھی فیض نے جیل سے لکھی تھی :

"منٹو کی وفات کا سُن کر بہت دُکھ ہوا۔ سب کمزوریوں کے باوجود وہ مجھے نہایت عزیز تھے۔ اور اس بات پر مجھے کچھ فخر بھی ہے کہ وہ امرتسر میں میرے شاگرد تھے۔ اگرچہ یہ شاگردی برائے نام ہی تھی۔ اس لیے کہ وہ کلاس میں تو شاید ہی کبھی آتے

ہوں۔ البتہ میرے گھر پر اکثر صحبت رہتی تھی۔ اور جینوف فرائڈ اور موپساں اور دانتے جانے کس کس موضوع پر گرم مباحثے ہوتے تھے۔ بیس برس گزر چکے ہیں لیکن یوں لگتا ہے کل کی بات ہے ہمارے شرفاء جنہیں دورِ حاضر کے فن کار کی شکستہ دل کا نہ احساس ہے نہ اس سے کوئی ہمدردی ——— غالباً یہی کہیں گے کہ منٹو مر گیا تو اس کا اپنا قصور تھا۔ بہت پیتا تھا۔ بہت بے قاعدہ زندگی بسر کرتا تھا۔ صحت کا ستیاناس کر لیا تھا وغیرہ وغیرہ ——— لیکن یہ کوئی نہیں سوچے گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ ایسے ہی کیٹس نے بھی اپنے آپ کو مار رکھا تھا۔ برنز نے بھی، موذاٹ نے بھی۔ اور بھی کئی نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ معاشی حالات کی وجہ سے فن اور زندگی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوں تو دونوں میں سے ایک کی قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔ دوسری صورت سمجھوتہ بازی کی ہے جس میں دونوں کا کچھ حصہ قربان کرنا پڑتا ہے۔ اور تیسری صورت ان دونوں کو یکجا کر کے جد و جہد کا مضمون پیدا کرنے کی ہے جو صرف عظیم فنکاروں کا حصہ ہے۔ منٹو عظیم نہیں تھا لیکن بہت دیانتدار بہت ہنرمند اور قطعی راست گو ضرور تھا۔ میرے خیال میں اس کا گھر تمہارے راستے ہی میں ہے۔ گزرتے ہوئے وہاں سے ہو آنا اور میری طرف سے بہت پیار اور دلی تعزیت پہنچا آنا۔"

اس چٹھی کے کئی سال بعد بھی فیض اس "راستے والے گھر" کو نہ بھول سکا۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق جب تک منٹو کی بیوی صفیہ زندہ رہی فیض وہاں جاتے اور منٹو کی باتیں کرتے۔ ایک دفعہ تو انھوں نے اپنا مجموعۂ کلام سعادت حسن منٹو کے نام معنون کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ لیکن برا ہو اس پبلشر کا وہ نہیں مانا۔ روس میں بھی فیض صاحب نے یہ چاہا کہ منٹو کے منتخب افسانے وہاں سے چھپ جائیں لیکن وہاں بھی بات کچھ بنی نہیں۔

اب "ٹھنڈا گوشت" کی رُوداد سنیے جس کے مقدمے میں فیض احمد فیض نے ایک خاص رول ادا کیا ———

"زحمتِ مہرِ درخشاں" میں منٹو لکھتا ہے: ———

"عارف عبد المتین صاحب افسانہ" ٹھنڈا گوشت " کا مسودہ لے گئے اور انھوں نے اسے "جاوید" کے خاص نمبر (مارچ ۱۹۴۹ء) میں شائع کر دیا۔

پرچہ چھپ کر مارکیٹ میں آگیا۔ اندرونی اور بیرونی ایجنسیوں میں بھی تقسیم ہو گیا۔ یہاں تک تو خیریت رہی۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ میں مطمئن ہو گیا کہ اب " ٹھنڈا گوشت " پر کوئی آفت نہیں آئے گی۔ مگر پریس برانچ کی باگیں ابھی چودھری محمد حسین صاحب کے ہاتھ میں تھیں۔ گو ضعیفی کے باعث ان کے ہاتھ بہت کمزور ہو چکے تھے۔ مگر انھوں نے زور کا ایک جھٹکا دیا اور پولیس کی مشینری حرکت میں آگئی۔

میں نے ایک روز اُڑتی سُنی کہ چھاپہ پڑا ہے اور پولیس جاوید کے خاص نمبر کے پرچے اُٹھا کر لے گئی ہے۔ میں نے جان پہچان کے لوگوں سے پوچھا کسی نے اس خبر کی تصدیق کی۔ کسی نے کہا:

"اجی ہٹائیے یہ جاوید والوں کا پبلسٹی اسٹنٹ ہے"۔ اس دوران میں "جاوید" کے مالک نصیر انور کا رقعہ ملا:

منٹو صاحب،

ایک خبر سُنیے۔ آج پولیس نے دفتر "جاوید" پر چھاپہ مارا۔ بچے کھچے پرچے اپنے قبضے میں لے لیے۔ باقی پرچوں کی جانچ پڑتال ہوئی تو ڈپٹی رجسٹرار نے واضح کیا کہ تمام پرچے ہند پاک کے مختلف اسٹیشنوں پر سپلائی ہو چکا ہے۔

رجسٹر میں سے تمام ایجنسیوں کے پتے نوٹ کر لیے گئے۔ اور آئندہ سپلائی کا حساب کتاب بند کر دیا گیا۔ یہ کارروائی گرفتاری کا پیش خیمہ تھی اور مجھے یقین ہے کہ جلد ہی ہم ملزموں کے کٹہرے میں ہوں گے۔ ایک بات اور قابلِ ذکر ہے کہ ایک مقامی ادارہ اس چھاپے کو اختراع اور پروپیگنڈے سے منسوب کرتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ خیر اس کی تصدیق خود بخود ہو جائے گی۔ مجھے تو یہ کہنا ہے کہ اب ذرا وہیں چلیے جہاں تین بار پہلے سزا پانے پر آپ بری قرار دے دیے گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بار آخری بار ہوگی۔

خبر کی تصدیق ہو گئی۔ معاملہ پریس ایڈوائزری بورڈ کے سامنے پیش ہوا۔ جس کے کنوینر کرنل فیض احمد فیض ایڈیٹر پاکستان ٹائمز تھے۔ اس میں "جاوید" کے مالک نصیر انور بھی موجود تھے۔ ان کی زبانی اس میٹنگ کی مختصر روداد سُنیے:

"پاکستان ٹائمز" کے دفتر میں پریس ایڈوائزری بورڈ کی میٹنگ تھی۔ فیض احمد فیض کنوینر تھے۔ میٹنگ میں ایف، ڈبلیو، بسٹن (سول ملٹری گزٹ) مولانا اختر علی (زمیندار) حمید نظامی (نوائے وقت)، وقار انبالوی (سفینہ) اور امین الدین صحرائی (جدید نظام) شریک تھے۔ چودھری محمد حسین نے "جاوید" کا خاص نمبر پیش کیا۔ آپ نے سب سے پہلے پرچے کے باغیانہ اور اشتعال انگیز مضامین نظم و نثر گنوائے۔

"غلامی سے آزادی تک"، "رقصِ بسمل"، "سیلابِ چین" یہ تھیں نظمیں —— مضامین میں "لورینگ سے فلیٹی تک"، "کھیڑا بہادر کی جے" اور "چین کتنی دور ہے" زیرِ بحث لائے گئے۔ فیض حکومت کے عاید کردہ الزام کی تردید کرتے رہے۔ دیگر اراکین نے ہاں میں ہاں ملائی اور یوں یہ سیاسی الزام ٹل گیا —— لیکن نزلہ "ٹھنڈا گوشت" پر گرا۔ فیض صاحب نے جب اسے غیر فحش قرار دیا تو مولانا اختر علی گرج اُٹھے: "نہیں نہیں۔ اب ایسا ادب پاکستان میں نہیں چلے گا۔" جناب صحرائی صاحب نے اس پر صاد کیا۔ وقار صاحب نے افسانے کو ملعون و مطعون قرار دیا۔ حمید نظامی نے "نوائے وقت" کا ساتھ دیا۔ اور جب الف۔ ڈبلیو لیسٹن کو چودھری صاحب نے انگریزی میں "ٹھنڈا گوشت" سمجھایا تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ فرمانے لگے: "اس کہانی کی تھیم یہ ہے کہ ہم مسلمان اتنے بے غیرت ہیں کہ سکھوں نے ہماری مُردہ لڑکی تک نہیں چھوڑی۔" مجھے ہنسی تو آگئی لیکن جب چودھری صاحب غلط ترجمانی پر مُصر رہے تو مجھے افسوس ہوا۔ میں نے لاکھ سمجھایا۔ فیض صاحب نے بھی ہر طرح سے اطمینان دلایا لیکن فیصلہ یہ ہوا کہ اب عدالت ہی اس کا فیصلہ کرے۔"

کرنل فیض احمد فیض پروسی کیوشن کی طرف سے تھے اور صفائی گواہ نمبر پانچ تھے۔ جب ان کی باری آئی تو انھوں نے اپنے بیان میں کہا: ——

"میری رائے میں افسانہ فحش نہیں ہے۔ ایک افسانے کے الگ الگ الفاظ کو فحش یا غیر فحش کہنے کے کوئی معنی نہیں۔ جب افسانے پر تنقید کرتے وقت مجموعی طور پر تمام افسانہ زیرِ نظر ہوگا اور ہونا چاہیئے۔ محض عریانی کسی چیز کے فحش ہونے کی دلیل نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس افسانے کے مصنف نے فحش نگاری تو نہیں کی ہے لیکن ادب کے اعلیٰ تقاضوں کو بھی پورا نہیں کیا ہے۔ کیونکہ اس میں زندگی کے بنیادی مسائل کا تسلی بخش تجزیہ نہیں ہے۔"

جرح کے جواب میں فیض نے کہا:

"میری بھیپیاں لے رہے تھے" اگر موضوع تقاضا کرے تو میں ایسے الفاظ کا استعمال جائز سمجھتا ہوں۔ "منہ بھر بھر کے بوسے لیے"۔ "چوس چوس کر اس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا۔" یہ الفاظ پارلیمنٹری نہیں لیکن ادبی اعتبار سے جائز ہیں..."

منٹو کو تین مہینے قید با مشقت اور تین سو روپیہ جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اکیس یوم مزید قید با مشقت۔ اپیل کرنے پر منٹو بری ہوگیا۔ جرمانہ جو منٹو نے ادا کردیا تھا اس کو واپس مل گیا۔ شام کو محفل ہوئی۔ وہسکی اور سوڈے کے بوتل کھلی۔ فیض صاحب کو بھی دعوت دی گئی۔ لیکن وہ نہیں آئے۔

"ٹھنڈا گوشت" کا مقدمہ تقریباً ایک سال چلا۔ لیکن منٹو کچھ تھک سا گیا۔ لکھتا ہے:

"دماغ کی کچھ عجیب ہی کیفیت تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ لکھنا چھوڑ دوں یا احتساب سے قطعاً بے پروا ہو کر قلم زنی کرتا رہوں۔ سچ پوچھیے تو طبیعت اس قدر کھٹی ہوگئی تھی کہ جی چاہتا تھا کوئی چیز الاٹ ہو جائے تو آرام سے کسی کونے میں بیٹھ کر چند برس قلم اور دوات سے دور رہوں۔ دماغ میں خیالات پیدا ہوں تو انھیں پھانسی کے تختے پر لٹکا دوں۔ الاٹمنٹ میسر نہ ہو تو بلیک مارکٹنگ شروع کردوں۔ یا ناجائز طور پر شراب کشید کرنے لگوں۔ . . ."

منٹو اور فیض ہم عمر تھے۔ دونوں پر روسی ادب کا نمایاں اثر تھا۔ دونوں زند بلانوش تھے۔ لیکن پھر بھی منٹو اور فیض میں بہت فرق تھا۔ منٹو کی تحریروں پر پانچ بار مقدمے چلے۔ فیض کی کسی تحریر پر مقدمہ نہیں چلا۔ وہ تو راولپنڈی کانسپریسی کیس کے سلسلے میں پانچ سال کے لیے جیل میں ڈال دیے گئے۔ منٹو کے ساتھ پولیس نے ایسا سلوک کیا جو گھٹیا قسم کے اخلاقی ملزموں سے کیا جاتا ہے۔ فیض کے ساتھ پولیس نے کبھی بدتمیزی نہیں کی کبھی وحشیانہ سلوک نہیں کیا۔ اور کچھ طنز نگاروں کا تو خیال ہے کہ فیض صاحب پولیس والوں سے ملے ہوئے ہیں۔ ان سے کہہ رکھا ہے کہ وقت کی نزاکت دیکھ کر مجھے جیل بھیج دیا کرو۔

منٹو جب بمبئی کی کسی کھولی میں رہتا تھا اور ایرانی ڈھابے میں چائے پیتا تھا تو فیض صاحب تاج محل ہوٹل میں کھانا کھایا کرتے تھے۔ منٹو نے ہندوستان پاکستان کے باہر کبھی قدم نہیں رکھا تھا جبکہ فیض صاحب بیرون ممالک کے دورے اکتا دینے والی حد بھی پار کر چکے تھے۔ منٹو نے تو کبھی ہوائی جہاز کے اندر جھانک کر بھی نہ دیکھا ہوگا۔ فیض کی دو لڑکیاں تھیں تو منٹو کی تین۔ فیض صاحب کی بچیاں انگریزی اسکولوں کی پیداوار ہیں جبکہ منٹو کے پاس کبھی کسی وقت نہ تو بیوی کی بیماری کے علاج کے لیے پیسہ ہوتا تھا اور نہ بچیوں کی تعلیم کے لیے۔ فیض کے پیچھے ایک منظم بین الاقوامی تحریک تھی۔ منٹو اکیلا تھا۔ فیض کے زکام کے علاج کے لیے ماسکو کے تمام ہسپتال کھل جاتے تھے۔ منٹو زکام کو بیماری مانتا ہی نہیں تھا۔

کافی ہاؤس دلی کے ایک لطیفے کے مطابق منٹو کو اس کے کچھ دوستوں نے یہ رائے دی کہ اپنے افسانوں کے مجموعہ کا دیباچہ فیض صاحب سے لکھوائے۔ منٹو نے بات یہ کہہ کر ٹال دی کہ وہ فیض کے بارے میں کچھ اونچا سنتا ہے۔ پوچھا، کیوں

تو منٹو نے مسکرا کے ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں یہ شعر پڑھ دیا:

فیض احمد فیض سے بڑھ کر کوئی شاعر نہیں
جو چمن میں رہ کے مارے روز ویرانے کی . . .

فیض نے کوئی نثری سوانح اپنے بارے میں نہیں چھوڑے منٹو کی خود نوشت تحریروں سے اس کے پورے حالات و حوادث زندگی پر ایک خوبصورت فلم بن سکتی ہے۔ جہاں تک ناشروں کا تعلق ہے فیض نے ہر پبلشر سے فیض پایا یا منٹو کو ہر پبلشر نے دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ منٹو کو سیاست سے نفرت تھی۔ فیض سیاست کے بغیر سانس نہیں لے سکتے تھے۔ منٹو اردو نثر کا سب سے بانکا اور بے باک افسانہ نویس تھا۔ فیض اردو شاعری کا سب سے سیریس اور سیاسی شاعر تھے۔ لیکن عشق سے کبھی دور نہیں بھاگے۔ اپنی ایک نہایت مختصر سی نظم میں (کچھ عشق کیا کچھ کام کیا) انہوں نے اپنی زندگی کی ساری رُومانیت بکھیر دی ہے:

وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے
ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور عشق سے کام اُلجھتا رہا
پھر آخر تنگ آ کر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

منٹو کے بارے میں ایک بار پھر فیض نے اپنے تاثرات دوہرائے تھے۔ محفل سجی ہوئی تھی۔ سوڈے کھلے ہوئے تھے۔ بات منٹو کی چل پڑی۔ فیض بول اُٹھے:

"تھبی منٹو اپنا شاگرد تھا۔ ایم اے او کالج امرتسر میں وہ میری کلاس میں تھا۔ پڑھتا وڑھتا نہیں تھا۔ بس شرارتی تھا۔ مجھ سے تو وہ عمر میں بھی کوئی دو تین مہینے جونیر ہو گا۔ تھا ذہین، کسی کو خاطر میں

بھی نہ لاتا تھا۔ بس میری عزت کرتا تھا اور مجھے اُستاد مانتا تھا۔ میں نے اسے گورکی کے افسانوں کا ترجمہ کرنے کو دیا۔ اس کے بعد اور ترجمے دیے۔ وہ لیکھک بن گیا۔ اُس نے بہت عمدہ افسانے لکھے۔ لیکن ۱۹۵۰ء کے بعد وہ پٹری سے اتر گیا۔ فلم والے اس سے ایک بوتل کے عوض جس قسم کی کہانی چاہتے تھے لکھوا لیتے تھے۔ اُس پر جب بھی فحاشی کے سلسلے میں مقدمہ چلا ہم دفعہ DEFENCE WITNESS تو ہمیں تھے۔ کل چار مقدمے تھے۔" کالی شلوار"، "ٹھنڈا گوشت"، "کھول دو" اور "دھواں" پر۔ تین بار ہم اُسے چھڑا لائے چوتھے مقدمے سے پہلے سرکار نے ہمارا بند وبست کر دیا۔ ہم جیل خانے چلے گئے اور منٹو کو قید ہو گئی۔ اللہ غریق رحمت کرے مولانا اختر علی خان اور شورش کاشمیری کو۔ ان کی حسرت پوری ہو گئی۔"

ایک آٹوگراف میں فیض لکھتے ہیں:

"منٹو اگر اتنا بڑا انسان بھی ہوتا جتنا بڑا فن کار تھا تو شاید ہمیں اس کا ماتم اتنی جلد نہ کرنا پڑتا۔"

اپنی بوتل پر تو فیض صاحب کو بھی ناز تھا۔ بوتل کے ساتھ ساتھ اپنے سگریٹ پر بھی۔ محفلوں میں جب بھی بیٹھتے سگریٹ کی جھڑی لگا دیتے۔ پینے کا چسکا تو انھیں طالب علمی کے زمانے میں ہی پڑ گیا تھا۔ ساری عمر پیتے رہے لیکن کہتے ہیں آخری سال پرہیز گار ہو گئے تھے۔ اندر کمار گجرال سابق سفیر سوویت یونین، ماسکو کا ایک قصہ سناتے ہیں جب فیض صاحب کو روسی ڈاکٹروں نے ہسپتال میں بند کر دیا تھا، جہاں ڈاکٹر زیڈ، اے احمد، ہاجرہ بیگم اور پی، سی، جوشی بھی تھے۔ گجرال صاحب رقم طراز ہیں:

"ایک دن مجھے فون پر کہنے لگے: ـــــــ "بھائی صاحب ملنے آؤ گے تو ہماری پیاس کا دھیان کر کے آنا۔"

میں نے کہا ـــــــ "غضب کر رہے ہیں آپ۔ ڈاکٹروں نے آپ کو سخت منع کر رکھا ہے۔"

"ارے بھائی تم بھی خوب ہو۔ ڈاکٹروں نے مجھے منع کر رکھا ہے۔ آپ کو تو نہیں۔ اور یوں

بھی ڈاکٹر احمد بُرا مان رہے ہیں۔"

لیکن غضب تو یہ ہُوا کہ اُن کی موت اُس وقت آئی جب تقریباً ایک برس سے وہ مکمل پرہیزگار ہو گئے تھے اور لوگ انھیں حال ہی میں لندن میں مل کے آئے تھے۔ اور وہ اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ پہلے سے زیادہ پُر صحت لگ رہے تھے۔"

ستم ظریفی تو یہ ہے کہ یہ لندن والے ترقی پسند مے نوش بھی وہی لوگ تھے جنھوں نے ڈاکٹروں کے کہنے پر چھوڑ رکھی تھی ——— بہرحال منٹو کی طرح گجرال صاحب بھی فیض کے شاگردوں میں تھے لیکن بہت جلد ان کا رشتہ ان کے اپنے بیان کے مطابق، شاگرد، استاد کی حد پھلانگ گیا۔ منٹو کا یہ رشتہ کیوں نہیں پھلانگا، وجہ صاف ہے۔ منٹو عوام کا ادیب ہے فیض صاحب خواص کے۔

گجرال صاحب جب لاہور میں ۱۹۸۳ء میں گئے تو فیض کے ہاں اپنی بیوی سمیت کھانا کھایا۔ فرماتے ہیں: ———

"اگلے دن ہم دونوں کھانے کے لیے اُن کے گھر پہنچے۔ ایلیس نے صرف اپنی دونوں بیٹیوں اور داماد وں کو بُلایا تھا۔ سلیمہ اور منیزہ بہت پہلے دلی آئی تھیں تب تو بہت چھوٹی تھیں۔ اب تو اُن کے بچّے بہت پیارے لگ رہے تھے۔ فیض کو تو معلوم تھا کہ میں ہمیشہ ہی بوتل سے دُور رہا ہوں۔ لیکن پھر بھی ہندوستانی وہسکی حاضر تھی۔ میں نے پوچھا: یہ کیسے ہم تو سنتے ہیں کہ قانون اب گھروں کے اندر بھی محتسب بھجوا دیتا ہے۔ اور پھر یہ ہندوستانی وہسکی یہاں کیسے پہنچی۔"

"ارے سب چلتا ہے میاں، ہم اور کون سے حکم مان رہے ہیں جو اس پر پابند رہیں۔"

کراچی میں کسی نے ایک لطیفہ سُنایا تھا کہ اکیلے پینا زیادہ خطرناک ہے کیونکہ ضیا صاحب کے راج میں اب دیواروں کے بھی آنکھیں ہوتی ہیں (پہلے صرف کان ہوا کرتے تھے) لیکن بڑی پارٹی میں آسان ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ پارٹی کے سائز کے حساب سے حسبِ درجہ کسی فوجی افسر کو ضرور مدعو کر لیجیے۔"

گجرال صاحب شاید بھُول گئے ہیں، فیض کو اس کی بھی پابندی نہیں تھی کیونکہ وہ انگریزی فوج کے سابق کرنل تھے۔ ایکس سروس مین ہونے کی حیثیت سے ان پر ضیا صاحب کا کوئی شراب والا قانون نہیں لگتا۔

فیض اگر دلّی میں سکونت اختیار کر لیتے تو ایکس سروس مین ہونے کے ناطے انھیں بھی ڈیفنس کالونی میں نہیں تو پچیم وہار میں ضرور ایک عدد پلاٹ تو مل ہی جاتا اور ممکن ہے یوں بھی ظل حسنین زیدی اور اندر سروپ دت کی طرح کوئی کٹیا کھڑی کر لیتے۔

فیض صاحب کا دلّی میں مکان نہ بنا یا نہ بنا لیکن منٹو کا لاہور میں راستے والا گھر یعنی لکشمی بلڈنگ والا فلیٹ کرایہ کا تھا۔ اور پورے ادب میں صرف منٹو ہی تھا جس کے انتقال پر ناشروں اور کتب فروشوں نے انار کلی لاہور میں سہ پہر تک اپنی دوکانیں بند کر دی تھیں۔ "سعادت حسن منٹو کے انتقال کی وجہ سے آج دُکان بند رہے گی" ایسا نوٹس کسی اور ادیب کے انتقال پر شاید ہی لگا ہو۔ فیض صاحب کے انتقال پر کوئی ایسا بورڈ نہیں لگا۔ حالانکہ کراچی میں رائٹرز گلڈ کے فنکشن میں فیض "بک سیلر" بھی بنے ہیں بقول ابراہیم جلیس:

دوستو آؤ چل کے دیکھیں گے
فیض صاحب کتاب بیچیں گے

منٹو کہتا تھا میں کچی شراب بیچ سکتا ہوں لیکن کتاب نہیں بیچ سکتا۔ صرف لکھ سکتا ہوں پرنٹر اور پبلشر بھی نہیں بن سکتا۔ حفیظ جالندھری والی "دکانداری" منٹو سے نہ ہو سکی۔

ابو سعید قریشی کے بھائی احمد سعید اپنے مضمون "سعادت حسن سے منٹو تک" میں لکھتے ہیں:

"منٹو کے کئی چہرے میری آنکھوں کے سامنے یکے بعد دیگرے ابھرے: جن میں پہلے اس کا آخری چہرہ، آخری صورت دکھائی دی۔ یہ غالباً ۱۹۵۲ء کا ایک خزاں رسیدہ اجڑا ہوا چہرہ تھا۔ . . میں اب بھی جب اُسے تصور میں لاتا ہوں تو لرز جاتا ہوں۔ . . میں اُن دنوں کالج میں لیکچرار تھا۔ نفسیات اور فلسفہ کا لیکچرار۔ جس حیثیت میں میں نے منٹو کے "ٹھنڈا گوشت" کے فحش نگاری کے مقدمہ میں ایک وکیل صفائی کے طور پر گواہی دی تھی (اس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا) اس کے کالج آنے کی سنسنی خیز خبر خزاں کے اُڑتے ہوئے پتوں کی طرح پھیل گئی۔ وہ مجسّم خزاں ہی بن کر آیا۔ ایک بوسیدہ اچکن پہنے، وہ اس کا ایک حصہ ہی لگا۔ اس کے بال سفیدی پکڑنے لگے تھے۔ جن میں خلافِ معمول کنگھی بھی نہیں کی گئی تھی۔ اب اس کی بڑی بڑی ذہین آنکھیں میلے اور بے جان بلب کی طرح تھیں۔ چہرہ پژمردہ تھا۔ ایک دائم المریض آدمی کا چہرہ اور چال ڈھال میں اس کی مخصوص خود اعتمادی مفقود تھی۔ بیماری نے اس کی مقناطیسی کشش

سلب کر لی تھی۔ اُس نے جیسے آنکھیں چُراتے ہوئے خطاوارانہ سے انداز میں مجھے ایک طرف
لے جاکر رازدارانہ لہجہ میں کہا:

"مَیں نے ٹیکہ لگوانا ہے۔ کیا آپ کے پاس کچھ پیسے ہوں گے، پانچ رُوپے؟"

مَیں اُس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"علاج کروا رہا ہوں نا" اس نے وضاحت کرتے ہوئے مزید کہا۔

منٹو کا ہمارے گھر سے پُرانے اور گہرے تعلقات کی بنا پر مجھ سے کوئی مطالبہ کرنے کا
حق تھا۔ اس پر تو منہ مانگی دولت نچھاور کرنے کو جی چاہتا تھا۔

اُس وقت میرے ذہن میں اپنے یہ الفاظ ... "آپ نے یہاں (پاکستان) آکر
غلطی کی" جو مَیں نے اُسے غالباً ۱۹۴۸ء میں بمبئی سے ہجرت کر کے لاہور آنے پر کہے تھے۔
کیوں کہ اُن دنوں فلمستان میں اُس کا طُوطی بولتا تھا جبکہ یہاں فلمی صنعت اور اسٹوڈیوز
اُجڑ چکے تھے۔ جو اس کی بقاءِ عزت اور مستقل ذریعۂ معاش کا ممکنہ وسیلہ بن سکتے تھے۔
خوش قسمتی سے میری جیب میں پانچ روپے تھے جو مَیں نے بلا تامّل اُسے پیش
کردیے۔ رُوپے لے کر وہ جلدی سے کالج سے نکل گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اتنی رقم سے
کیا کرے گا۔ مَری بریوری کی کلب وہسکی کا آدھا خرید کر اس کی مہلکِ آتشِ سیّال کا ٹیکہ
لگائے گا۔"

قطعہ

اَب کوئی پوچھے بھی ہم سے
تو کیا شرحِ حالات کریں
دل ٹھہرے تو درد سُنائیں
درد تھمے تو بات کریں

—— فیضؔ

باب : دس

نال کا رشتہ

کہا جاتا ہے کہ بیرونِ ممالک میں فیض صاحب کو پاکستان بہت یاد آتا تھا۔ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے تھے اور کبھی کبھی روتے تھے۔ اپنی سسرال یعنی لندن میں انھوں نے کئی بار جب بھی گرمیِ محفل میں یک لخت پاکستان جانے کا فیصلہ سنایا تو یار دوست حیران رہ جاتے تھے۔ اپنی ان گنت بھارت نوازیوں کے باوجود وہ ایک ٹھوس محبِ وطن تھے جنھوں نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی وزٹینگ پروفیسر شپ ٹھکرائی۔ کلکتہ یونیورسٹی کی پروفیسر شپ کی آفر کا جواب تک دینا مناسب نہ سمجھا۔ ان کے دیے میں پاکستان کی لو ہمیشہ اونچی رہی۔ دوسرے ملکوں کے بارے میں ان کی آنکھ ہمیشہ کھلی رہی۔ آزمائش کے دنوں میں بھی انھوں نے کبھی کالے کاگل سے کام نہیں لیا۔ دودھ کو ہمیشہ دودھ سمجھا اور پانی کو ہمیشہ پانی ——— کسی دوسرے ملک میں بس جانے یا نوکری کرنے کا کبھی سوال ہی نہیں اٹھایا۔ صرف بیروت والا معاملہ روح فرسا ہے۔ نارن ایڈ کے بارے میں بھی ان کے خیالات کچھ اپنے ہی انداز کے تھے۔ اپنے "ویو پوائنٹ" والے انگریزی مضمون میں پاکستان فارن سروس فیم مسٹر خالد حسین لکھتے ہیں:

"پچھلے سال ہی راقم الحروف کو کسی نے دہلی یا بمبئی میں ایک ملازمت تجویز کی تھی میں نے فیض سے پوچھا۔ کہنے لگے : ———

"ہندوستان تھوڑے دنوں کے لیے جانا دوسری بات ہے لیکن اس قسم کی پیش کش قبول کرنا ہمیشہ کے لیے خود اختیاری جلاوطنی اختیار کرنے کے مترادف ہوگا۔ تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ آئیس لینڈ چلے جاؤ۔ لیکن ایک دفعہ اگر تم نے ہندوستان میں کوئی ملازمت کر لی تو تم پاکستان سے بند ہے اپنے نال کے رشتے کو قطع کر دو گے۔"

——— (ترجمہ: مس قرۃ العین حیدر)

یہ مت سمجھیے کہ خالد حسین کو اردو نہیں آتی۔ ورنہ نال کا رشتہ ڈھیلا ہو جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ ترجمہ سلمیٰ صدیقی کی فرمائش پر ہوا جس کے لیے صابر دت "فن اور شخصیت" میں شکر گزار ہیں ویسے بھی شکر گزاری کے علاوہ ان کے صرف دو ہی شغل ہیں۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا۔ انھوں نے اس مضمون کو چھاپ کے جو اردو ادب کی خدمت کی ہے، آنے والی نسلیں کبھی بھلا نہ پائیں گی۔
اس مضمون میں یہ لکھا گیا ہے کہ فیض صاحب لندن کی ہر گلی اور ہر پب سے واقف ہیں۔ لندن میں وہ بار بار آتے ہیں۔ لندن میں وہ کبھی اکیلے نہیں ہوتے تھے۔ آتے ہی چند لوگوں کو فون کرتے ہیں۔ اور پھر اپنی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔ فیض صاحب کی قوتِ برداشت کی قلعی لندن میں ہی آ کر کھلتی ہے۔ یہاں آ کر وہ کسی پکچر کا میٹنی شو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ گول گپے بھی کھا لیتے ہیں۔ اور کسی دوشیزہ کے ساتھ چائے بھی پی لیتے ہیں۔ اسی لندن میں جب ایک صاحب نے اُن سے کہا کہ "روسی آپ کے دوست ہیں ان سے کہو کہ افغانستان سے چلے جائیں۔"
"آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے" والی بات ہو گئی۔ جواب دینا پڑا۔ فرمایا:

"روسی سیاست پر سنجیدہ گفتگو یا سیاسی بہیج محض پارٹی ممبروں تک محدود رکھتے ہیں، میں پارٹی ممبر نہیں ہوں۔ کبھی نہیں رہا۔ یہ اُن کے لیے بہت اہم چیز ہے۔ اگر آپ برادرانہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہیں تو آپ سے اُن کا برتاؤ مختلف ہے میری وہ بہت عزت کرتے ہیں کیونکہ میں ایک شاعر ہوں اور لینن پیس پرائز حاصل کر چکا ہوں۔ لیکن سیاسی گفتگو وہ پارٹی ممبروں کے ساتھ ہی کرتے ہیں۔"

تمام پر ضمیر جاتا ہے کہ لینن پیس پرائز شاعروں اور ادیبوں کو کیسے اور کیونکر ملتا ہے۔ فیض صاحب تو

باقاعدہ سیاسی شاعر تھے۔ راولپنڈی سازش کیس میں چار سال سے اوپر جیل کاٹی۔ اور اگر روسی لوگوں نے اُن سے کبھی کوئی سیاسی گفتگو نہیں کی تو سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے:

فیض نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنا کیا کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے

بیرونی ممالک میں پاکستان کے تہذیبی و ثقافتی تعارف کے مسئلے کے بارے میں فیض صاحب لکھتے ہیں: ———

"ہمارا نام تو خیر سب لوگ جانتے ہیں اور بیشتر کو ہمارا محلِ وقوع بھی معلوم ہے لیکن پاکستان کیا ہے اور کیوں ہے اور ہمیں ایسا کون سا سرخاب کا پر لگا ہے جو کسی اور کے پاس نہیں یہ معدودے چند صاحبِ علم یا صاحبِ غرض افراد کے علاوہ بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ یہ سرخاب کا پر میں طنز سے نہیں کہہ رہا ہوں . . . یوں سمجھ لیجیے کہ ہر ملک نے اپنا ٹریڈ مارک بنا رکھا ہے جو ہر موقع پر تعارف اور جان پہچان کے کام آتا ہے۔

آپ نے کبھی غور کیا کہ ہمارا یعنی پاکستان کا ٹریڈ مارک کیا ہے؟ اگر نہیں کیا تو اب غور فرمائیے ورنہ پردیس میں بار بار اور جگہ جگہ آپ کو ایسے ہی سوالات کا سامنا ہو گا جو ابتدا میں لکھ چکا ہوں۔ اور اگر آپ کو ہند و پاکستان کی تاریخ، کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست ہندو مسلم چپقلش اور مسئلہ کشمیر کی تفصیلات بیان کرنے کی فرصت اور دماغ ہے تو بھی آخر آپ انفرادی سعی و تبلیغ سے کتنے اشخاص کو "مشرف بہ پاکستان" کر سکیں گے۔ اس سلسلے میں ہمارے سفارت خانوں کے عمال پر مدیرانِ جرائد اور مراسلہ نویس حضرات اکثر برستے رہتے ہیں۔ فلاں ملک میں پاکستان کی پبلسٹی نہایت ناقص ہے۔ آخر ہمارے سفارتی خانے کس مرض کی دوا ہیں۔ فلاں شہر سے مجھے ایک لفافہ موصول ہوا ہے جس پر پاکستان (انڈیا) لکھا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

تاج محل اور لال قلعہ تو ہمارے ہاں رہ گئے فیض صاحب کو ان کا کوئی افسوس نہیں۔ حالانکہ انتظار حسین کو آج تک اس کا ملال ہے۔ لیکن موہنجو دارو اور ٹیکسلا کا انھوں نے کیا کیا۔ فیض صاحب نے جب یہ مضمون لکھا تھا تو چٹاگانگ کے قبائلی کھیل، سلہٹ کی چٹائی اور کومیلا کی سنکھیا بھی پاکستان کی تھیں۔ وہ اس چیز کو ڈھونڈتے رہے جو نہ ہندوستان میں ہے نہ افغانستان میں۔ وہ ایک طرف تو سوات کے چشمے پر مرتے ہیں تو دوسری طرف پشاوری چپل کو نظر انداز کر کے پشاوری تختے پر ——— خٹک کا رقص انھیں اچھی طرح یاد ہے لیکن پنجاب کا بھنگڑا بھول گئے۔ سندھ کی رلی بھی انھیں بہت عزیز ہے اور بھاول پور کی صراحی بھی۔ مہندی اور زعفران تو ہمارے کشمیر میں رہ گئے اور پٹ سن کے کھیت میگھیا کے مچھیروں سمیت بنگلہ دیش نے سمیٹ لیے۔ سلہٹ کی چٹائی اور کومیلا کی سنکھیا نے بھی منہ پھیر لیا۔ سیالکوٹ کے لوہاروں نے خوبصورت ٹرنک بنانے بند کر دیے اور گدھا گاڑی کراچی میں اپنے آپ ہی بند ہو گئی۔ اب آپ ہی بتائیے کہ باقی رہ ہی کیا جاتا ہے۔ اردو کے مشاعرے بھی ہندوستان میں پاکستان سے زیادہ ہوتے ہیں۔ ویسے بھی اردو زبان ہندوستان میں پیدا ہوئی، وہیں پروان چڑھی ——— اب آپ خود ہی سوچیے کہ پاکستان کے سوا وہ کس چیز کو خالص پاکستانی کہہ کر پکاریں؟ درہ خیبر یا پھر شالامار ——— ؟ دونوں میں پھر ہندوستان چھایا ہوا ہے۔ تاریخ کو تو جغرافیہ نہیں بدل سکتا۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: ———

"انگلستان کے لوگ کرسمس، نیا سال، ایسٹر، گائی فاکس ڈے وغیرہ کا ہفتوں پہلے سے اہتمام کرتے ہیں اور قومی برادریوں نے بھی اپنی مخصوص تقریبات کے لیے رسوم و مناسک طے کر رکھی ہیں۔ ہمارے ہندوستانی بھائی بھی ہولی، دیوالی، بسنت اور دسہرہ پر کچھ ہنگامہ کر لیتے ہیں۔ لیکن ہمارا کوئی تہوار آجائے تو بیشتر تعطیل منا لینے کے سوا کسی کو کچھ نہیں سوجھتا۔ یہاں لندن میں عید آئی اور گزر گئی۔ یوم پاکستان آیا اور گیا اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔"

اب سوال یہ ہے کہ جن میلوں ٹھیلوں کو فیض صاحب منانا چاہتے تھے وہ تو سبھی ہندوستان والے تھے۔ اور ہندوستان میں ان تمام میلوں اور تہواروں میں مسلمانوں کی اتنی ہی شرکت ہے جتنی ہندوؤں اور سکھوں کی۔ تمام برصغیر میں کوئی ایسا میلہ تو گنوائیے جو صرف ایک فرقے کا ہو۔ یہاں تو شروع سے ہی میلے اور تہوار مشترکہ رہے ہیں۔ اسی لیے تو مس حیدر پاکستان سے چلی آئیں۔ اسی بات نے تو دریا میں آگ لگا دی تھی۔ حالانکہ

انھوں نے "آگ کا دریا" کافی پہلے لکھ چھوڑا تھا۔ اُتر پردیش کی ہی بات لے لیجیے، بچہ مسلمان کے گھر پیدا ہوتا ہے گیت کرشن کنہیا کے گائے جاتے ہیں۔ دیہاتی مسلمان گھروں کی شادیاں بغیر رام لیلا کے مکمل نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ سندھ میں آج بھی مسلمان عورتیں اپنی مانگ میں سیندور لگاتی ہیں۔ اس برِ صغیر میں مسلمانوں سے پہلے بھی مشترکہ کلچر تھا۔ اشوک بھی اسی کلچر کا حامی تھا اور اکبر بھی، دارا شکوہ بھی اور بابا لال بھی ——— یہ تو وہ تہذیب ہے جہاں ایک شخص نے کسی کو اوک سے پانی پیتے ہوئے دیکھ کر اپنا کاٹھ کا پیالہ پھینک دیا تھا۔
اس کلچر نے مختلف صورتوں میں مختلف راستے تلاش کیے۔ اس کلچر کی تنہائی فیض صاحب کی تنہائی سے مختلف تھی۔ یہاں ہجوم میں تنہائی نہیں بلکہ تنہائی میں ہجوم کا تصور رہا ہے۔ یہ مشترکہ کلچر کسی اخبار کی سرخی یا نظم کا عنوان نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ یہ آج بھی زندہ ہے عجائب گھروں اور آرٹ گیلریوں میں مقفل نہیں۔ اس کے بننے میں کئی ہزار برس لگے تھے اس کے بگڑنے یا بدلنے میں ۳۸ سال بہت تھوڑے ہیں۔ اس کلچر کا جادو جب بولتا ہے تو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ یہ تہذیب خالص مشرق کی ہے مغرب زدہ ذہن اس میں فٹ نہیں ہوتے۔
کلچر کی اساس زندگی ہے۔ ہندوستان کی مشترکہ کلچر زندگی کی رہنمائی کرتا ہے۔ کلچر کی پرکھ کا پیمانہ یہ ہے کہ اپنی اقلیتوں کے ساتھ سلوک کیسا کرتی ہے۔ اگر معیار یہ ہے تو ہندوستان کی کلچر ہندوستان کی تاریخ سے زیادہ پرانی ہے۔ اس کی ابتدا موہنجوداڑو اور ہڑپا میں ہوئی جو آج پاکستان میں ہیں۔ یہ تہذیب ٹیکسلا اور ملتان میں پروان چڑھی جو ابھی پاکستان میں ہیں۔ اس تہذیب کی نشوونما نظام الدین کی خانقاہ اور اجمیر شریف میں ہوئی جو ہندوستان میں ہیں۔ اس تہذیب کا کون سا جزو ہندوستان میں ہے اور کون سا پاکستان میں یہ کہنا بہت مشکل ہے منٹو نے بھی بہت کوشش کی لیکن پوری طرح سے بتا نہ پایا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ چابی سے تالا یا لاکر تو کھل سکتا ہے لیکن دل نہیں۔ اس ملک میں کوئی فاتح بن کر آیا تو کوئی پناہ گیر ہو کر، لیکن دونوں یہیں کے ہو گئے۔ ہر ایک نقش اس کلچر میں پنہاں ہے۔

پاکستان کی قومی تہذیب کے بارے میں فیض کا کہنا ہے کہ تہذیب اور قوم دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ پاکستانی قوم کیا ہے یہ سوال تہذیبی نہیں بلکہ سیاسی ہے۔ فیض لکھتے ہیں:

> "پاکستان کی سیاسی تاریخ ابھی بسم اللہ کے مراحل میں ہے۔ لیکن اس خطے کی تہذیبی تاریخ کی عمر پانچ ہزار سال سے اوپر ہے۔ چنانچہ ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم اپنی قومی اور تہذیبی تاریخ موہنجوداڑو اور ہڑپا سے شروع کریں۔ اگر یہ صورتِ حال ہمیں قبول ہے تو ہمیں وہ تہذیبی ورثہ بھی اپنانا ہوگا جو قدیم دور میں ویدک برہمنی یونانی اور بدھ معاشروں نے

پیدا کیا۔ اس میں الجھن یہ ہے کہ ہمیں اپنی فنی اور تہذیبی تصور اور
تجلی میں کافی ترمیم کرنی پڑے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم اپنی
تاریخ برصغیر ہند میں مسلمانوں کے دور سے شروع کریں۔ اس میں یہ
الجھن ہے کہ ہمارے اجداد کسی واحد قوم و وطن یا تہذیب کے نمائندہ
نہ تھے۔ ان میں عرب بھی تھے۔ ایرانی بھی تورانی بھی اور افغانی بھی۔ ہر ایک
کی تہذیب الگ اور تاریخ جدا۔ مذہبی اور اخلاقی قدروں کے اشتراک
اور طویل تاریخی اختلاط کے باعث ان تہذیبوں میں بہت سی باتیں مشابہ
ضرور ہیں لیکن کوئی ترک عرب تہذیب یا قومیت کو اپنانے پر تیار نہیں۔
نہ کوئی عرب ایرانی تہذیب و تاریخ کی وراثت قبول کرتا ہے۔ پھر ان
تہذیبوں کی ابتدا زمانہ قبل اسلام میں ہوئی اور ان کے موجودہ نام لیوا
اس قدیم وراثت سے نہ منکر ہیں نہ شرمسار۔"

فیض بھی نہ منکر ہیں نہ شرمسار کہ سیاسی اعتبار سے مملکتِ پاکستان کی عمر صرف چونتیس سال ہے۔ اور چونتیس سال میں کلچر تو کیا تاریخ کا ایک ورق بھی نہیں بنتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ فیض ہندو پانی مسلمان پانی میں یقین نہیں رکھتے۔ لیکن جب اوبرائے کانٹی نینٹل اسلام آباد میں جاتے تھے تو پاکستانی آملیٹ کا آرڈر دیتے تھے۔ کسی نے پوچھا: بھئی یہ پاکستانی آملیٹ کیا ہوتا ہے تو ہنس کے بولے: ہمارے فنی اور تہذیبی کاروبار کی کیفیت کچھ ایسی ہے جیسے بزرگوں کی آنکھ بچا کر سگریٹ پینا۔ آملیٹ تو وہی پرانا ہے اسلام آباد میں کھاؤ تو پاکستانی، اور جب اوبرائے نئی دہلی میں کھاؤ تو ہندوستانی۔

ایک جگہ اور اسی موضوع پر لکھتے ہیں: ———

"سیاسی اعتبار سے تو ہماری قوم واقعی ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئی
جب پاکستان نہیں تھا تو پاکستانی قوم کیسے ٹھہراتے لیکن تاریخی اعتبار
سے پاکستانی قوم ہندی مسلمان قوم کی وہ آبادی ہے جو پاکستان میں
بستی ہے اور جس میں کچھ غیر مسلم اقلیتیں بھی شامل ہیں۔ اس مسلم قوم
میں کچھ وہ لوگ ہیں جن کے اجداد دورِ اسلام کے بعد یہاں آئے اور
کچھ وہ جو ہمیشہ سے یہاں آباد تھے اور دائرہ اسلام میں شامل ہو گئے۔ یہ
نو وارد لوگ دینِ اسلام کے ساتھ اپنا کلچر یا تہذیب بھی ساتھ لائے۔ پھر

اُن کے کلچر اور یہاں کے قدیم مقامی کلچر کے اِمتزاج سے جو چیز پیدا ہوئی اسے ہم پاکستانی تہذیب یا کلچر کہتے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ پر کم از کم پانچ مذاہب کی یلغار ہوتی رہی ہے۔ اور یہی یلغاران کی تاریخ سازی کا بھی کام کرتی رہی ہے۔ اگر آج ہمارا مذہب اسلام ہے اور ہم سے پہلے ہمارے آباء واجداد کا مذہب کچھ اور تھا تو اس حقیقت کو ماننے سے انکار کیوں کیا جائے۔ اِس میں کسی کی ہیٹی نہیں ہوتی۔"

فیض کو اس بات سے انکار نہیں ہے کہ قومی کلچر کسی شہر، گلی، محلے یا کسی چھوٹے سے طبقے یا گھرانے کی پسند یا ناپسند نہیں ہوتا۔ سارے معاشرے کے اجتماعی ظاہر و باطن کو کلچر کہتے ہیں۔ فیض یہ بھی مانتے ہیں کہ کلچر ہیرا منڈی یا کسی قصائی کی دُکان پر نہیں ملتا۔ اس کی کوئی پرائس لسٹ نہیں ہوتی۔ یہ تو پرائس لیس ہے۔ آخر کار فیض کا مشن کیا تھا۔ لکھنے پڑھنے کو تو وہ ہمیشہ شغل سمجھتے تھے۔ ایک بار انھوں نے فرمایا تھا کہ

"پاکستان ٹائمز کی ایڈیٹری قائدِ اعظم کے کہنے پر ایک مشن کی تکمیل کے لیے اختیار کی۔ جب یہ مشن پورا ہو جائے گا میں ایڈیٹری چھوڑ دوں گا۔ پھر لکھنے پڑھنے کا شغل اختیار کر لوں گا۔ میرا یہ مشن ہے کہ ایک ایسی دُنیا بنے جس میں ہر شخص سے اس کی استطاعت کے مُطابق کام لیا جائے اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مُطابق مُعاوضہ دیا جائے۔"

یہ تو کارل مارکس کا مینی فیسٹو ہی انھوں نے آگے بڑھا دیا۔ پاکستان کے بارے میں انھوں نے کہا:

"میں تو یہ چاہتا ہوں کہ پاکستان میں ہر شخص کو جسمانی دماغی اور رُوحانی آزادی حاصل ہونا چاہیئے اور ہر شخص کو کم از کم ضروریاتِ زندگی میسّر آنا چاہئیں۔"

۱۵ ستمبر ۱۹۷۸ء کو بھوپال میں انھوں نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"اِس حقیقت کو تسلیم کر ہی لینا چاہیئے کہ بھائیوں نے اپنے اپنے

گھر علیحدہ بنا لیے ہیں اور انھیں علیحدہ کرنے والی دیوار کی تعمیر ہو چکی ہے۔ مگر یہ ممکن ہے کہ اس دیوار میں کھڑکیاں اور روشن دان بنائے جا سکتے ہیں۔"

جب بنگلہ دیش آزاد ہُوا تو انھوں نے کسی قسم کے روشن دانوں یا کھڑکیوں کی بات نہیں کی۔ افغانستان کی تحریک کے سلسلے میں بھی فیض صاحب نے زیادہ تر خاموشی سے ہی کام لیا۔ جب ہندوستانی فوجیں لاہور اور سیالکوٹ کے دروازے کھٹکھٹانے لگیں تب انھوں نے دو نظمیں فوجی مذمت کے انداز میں لکھیں لینن پیس پرائز کا سودا کافی مہنگا پڑا۔

اب کشمیر کا مسئلہ لیجیے۔
فیض صاحب نے اکثر کہا ہے کہ کشمیر کے بغیر پاکستان کا نقشہ مکمل نہیں ہو سکتا۔
کشمیر ہمارا ہے سارے کا سارا ہے۔
ویسے تو فیض صاحب نے کسی کو کبھی چانٹا نہیں مارا لیکن کشمیر کے معاملے میں انھوں نے خود کشمیر جا کر بھارت کے خلاف عملی طور پر جنگ میں حصہ لیا۔ بھارت کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ ڈوگرا راج کے خلاف لڑے۔
جب اس موضوع پر تفصیل سے پوچھا گیا تو بحوالہ نوائے وقت فیض صاحب نے مندرجہ ذیل جواب دیا:

"یہ ریاستوں کا چکر تھا۔ اور اس کے بارے میں معلوم یہ ہوا کہ راجہ فیصلہ کریں گے۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ ہم نے غلطی کی کہ راجستھان میں دونوں ابوں کا اعلان منظور کر لیا۔ . . کیونکہ کسی صورت میں وہ یہاں نہیں آ سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے وہاں قبضہ کر لیا اور ہماری حکومت نے مہاراجہ کے ساتھ کچھ معاہدہ وغیرہ کر لیا تھا۔ . . بجائے اس کے کہ ہم شیخ عبداللہ یا کسی اور لیڈر سے بات کرتے۔ ہم بات چیت کر رہے تھے مہاراجہ اور وزیر اعظم سے جو ہماری رائے میں صحیح نہیں تھی اسی وجہ سے کچھ اور لوگوں نے بھی کوشش کی کہ وہاں کے عوام کے ساتھ یا ان کے نمایندوں سے کچھ بات وغیرہ کی جائے۔ کیونکہ ہمارے خیال میں کشمیر کے بغیر پاکستان کا نقشہ ہی مکمل نہیں ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا ——— کیونکہ اوپر کے لوگوں نے اپنا کھیل شروع کر دیا۔"

ایک اور سوال کے جواب میں کہ کیا پاکستان ٹوٹ رہا ہے۔ بولے :

"ہمیں تو کوئی آثار نظر نہیں آتے ٹوٹنے کے، اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کافی عرصے سے اس قسم کے وسوسے ڈالے جارہے ہیں۔ یہ کوئی مٹھائی ہے کہ چیل اٹھا کے لے جائے گی۔ کیسے لے جائے گی؟"

فیض صاحب محبِ وطن تھے۔ اپنا ملک انھیں دل وجان سے پیارا تھا۔ وہ کسی چیز کے ٹوٹنے کے حق میں نہیں تھے۔ ویسے بھی بقولِ غالب :

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

جب بھٹو کی پھانسی کے بعد انھوں نے ملک چھوڑا تو عام طور پر یہ سمجھا جاتا رہا کہ انھیں مجبوراً ترکِ وطن کرنا پڑا۔ وہ ہندوستان بھی آئے۔ شہر شہر ان کا استقبال ہوا کئی یونیورسٹیوں نے انھیں پروفیسرشپ کی کی پیش کش کی لیکن وہ بیروت میں "لوٹس" کی ادارت کرتے رہے۔ جب وہ پاکستان واپس لوٹے تو نوائے وقت کے نامہ نگار نے ان سے "خود ساختہ جلاوطنی" کے بارے میں پوچھا۔ جواب میں فرمایا :

"کئی وجوہات تھیں۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہمارے پاس کوئی تعمیری کام نہیں تھا۔ اس لیے ہماری یہاں کوئی ضرورت تو تھی نہیں۔ دوسری بات یہ کہ کچھ عرصے سے کام شروع کر رکھے تھے ان کے لیے ہم چلے گئے۔ اور تبدیلی حالات کرتے چلے گئے۔ اور اس کے علاوہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ باقی ہم مائیں وغیرہ معذور نہیں رہ سکتے تھے۔"

ایک اور سوال کے جواب میں کہ آپ زندگی میں جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ کام مکمل ہوئے یا ادھورے رہ گئے۔ جواباً فرمایا :

"ہمارے خیال میں تو سب کام ادھورے رہ گئے۔ ہماری یہ خواہش

تھی کہ ہم کسی ایک مضمون پر عبور حاصل کریں یا پھر کسی ایک کلاسیک کا مکمل ترجمہ کریں۔ مثلاً شیکسپیئر کا اب تک کوئی مکمل ترجمہ نہیں ملتا۔ ایک کتاب "ٹائمز آف ایتھنز" پر کام شروع کیا تھا۔ لیکن وہ بھی ادھورا ہی رہا۔ صحافت شروع کی وہ ادھوری رہی اور بہتیرے کام ادھورے۔ خواہش تھی کہ ایک طویل نظم لکھا وہ پوری نہیں ہوئی۔ دوسری بات وہی کہ اردو زبان میں کسی بڑی کلاسیک کا ترجمہ ہوجائے۔ یہ بھی نہ ہوا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ چند نظموں کے بعد ہم نے ناتمام لکھ دیا تھا۔ ارادہ یہی تھا کہ اس کو آگے چلائیں جیسے ایک 'انتساب' تھی۔ خیال تھا کہ اس کو آگے بڑھائیں گے۔ پھر 'شہر آشوب' کی ابتدا کی، اس کے نیچے بھی ناتمام لکھ دیا۔ پھر 'زندان کی ایک صبح' شروع کی اس پر بھی ناتمام لکھ دیا۔ اب یہ ہے کہ ہمت اتنی نہیں رہی اس لیے جلد ہی بور ہوجاتی ہے۔ اس ناتمامی کی وجہ سوا اپنے کاہلی کے اور کوئی نہیں۔"

ویسے تو آشو رام آریہ ہوشیارپوری نے رگ وید کا اردو میں مکمل ترجمہ کرکے اردو کے پروفیسران کو شرمسار کر دیا ہے۔ اور گیتا کے درجنوں ترجمے ہو چکے ہیں۔ لیکن فیض صاحب شاید ترجموں سے متاثر نہیں ہوئے۔ دل محمد کی گیتا آج بھی ہزارہا انسان کی روح کو تسکین پہنچاتی ہے۔ اور چکبست کی رامائن بچے بچے کی زبان پر ہے۔ لیکن "بوطیقا" کے ترجمے کا غلط ترجمہ کرنے والا ماہر عروض پاکستانی نقادوں کے طعنے سہہ رہا ہے۔ جب ادب کی فہم ہی نہ ہو تو محض دیب صاحب کی شاگردی کا دعویٰ کہاں تک ساتھ دے سکتا ہے۔

پھر وہ پروانے جنھیں اذنِ شہادت نہ ملا
پھر وہ شمعیں کہ جنھیں رات نہ ہونے پائی

فیض احمد فیض

فیض نامہ

(تہتر سال نو ماہ سات دن)

۱۳ر فروری سنہ ۱۹۱۱ء سے ۲۰ر نومبر سنہ ۱۹۸۴ء

کالا قادر سے اسلام آباد تک

۱۳ر فروری سنہ ۱۹۱۱ء:

پیدائش قصبہ کالا قادر تحصیل نارووال ضلع سیالکوٹ (جو اب پاکستان میں ہے) جاٹ گھرانے میں پیدا ہوئے دادا بے زمین مزارع تھے۔ والد چودھری سلطان محمد وکالت کرتے تھے اور انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے صدر تھے۔ ڈاکٹر اقبال کے خاص دوستوں میں تھے۔ والدہ کا نام سلطان فاطمہ تھا۔ چار بھائی اور پانچ بہنیں تھیں۔ اسکول کے کاغذات میں تاریخ پیدائش ۷ر جنوری سنہ ۱۹۱۱ء اور ۷ر جنوری سنہ ۱۹۱۲ء ہے۔ دفتر بلدیہ سیالکوٹ میں تاریخ ۱۳ر فروری سنہ ۱۹۱۱ء ہے جو بقول فیض صحیح ہے۔

اسی سال کلکتہ سے دلّی ہندوستان کی راجدھانی بنا۔

دسمبر ۱۹۱۵ء : شیخ حسام الدین کی مسجد میں حفظِ قرآن سے تعلیم کا آغاز ہُوا۔

اپریل ۱۹۱۶ء : مولوی ابراہیم سیالکوٹی کے مکتب میں پہلی جماعت میں داخلہ لیا۔ اُردو اور عربی میں تعلیم۔ فارسی گھر میں بولی جاتی تھی۔

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء : جلیاں والا باغ امرتسر میں قتلِ عام۔

۱۹۲۰ء : تحریکِ خلافت۔

مئی ۱۹۲۱ء : اسکاچ مشن ہائی اسکول میں چوتھی جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد مڈل میں داخلہ لیا۔

اپریل ۱۹۲۳ء : ورنیکولر فائنل کا امتحان وظیفے کے ساتھ پاس کیا۔

۹ اگست ۱۹۲۵ء : کاکوری ٹرین کیس، اشفاق اللہ، رام پرساد بسمل گرفتار اور بعد میں پھانسی۔

۱۳ مارچ ۱۹۲۶ء : بھگت سنگھ نے لاہور میں "نوجوان بھارت سبھا" کا آغاز کیا۔

اپریل ۱۹۲۷ء : میٹرک کا امتحان اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ سے فرسٹ کلاس میں پاس کیا۔

مئی ۱۹۲۶ء : مرے کالج سیالکوٹ میں داخلہ۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی ان کے پہلے اُردو کے پروفیسر تھے۔

۳۰ر اکتوبر ۱۹۲۸ء : سائمن کمیشن کا بائیکاٹ، پنجاب کے لیڈر، لالہ لاجپت رائے انگریز کی لاٹھی سے زخمی۔

۱۷ر نومبر ۱۹۲۸ء : شیرِ پنجاب لالہ لاجپت رائے کا لاہور ہسپتال میں انتقال۔

دسمبر ۱۹۲۸ء : مرے کالج سیالکوٹ کے طرحی مشاعرے میں پہلی غزل پڑھی۔ انگریز پرنسپل نے ایک روپیہ انعام دیا۔ غزل کا پہلا شعر یہ تھا:

لب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو منت کشِ صہبا نہیں ہوتا

اپریل ۱۹۲۹ء : ایف اے (انٹرمیڈیٹ) مرے کالج سیالکوٹ سے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے استاد مولوی سید میر حسن سے فارسی اور عربی سیکھی۔

مئی ۱۹۲۹ء : گورنمنٹ کالج لاہور میں بی، اے آنرز میں داخلہ۔ پروفیسر صوفی تبسم سے تعلیم پائی۔

دسمبر ۱۹۲۹ء : گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالہ "راوی" میں پہلی نظم "مرے معصوم قاتل" چھپی۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء : لاہور کانگریس میں خود مختاری کی قرارداد۔ فیض نے

جواہر لال نہرو کو دُور سے دیکھا۔

۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء : بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو لاہور سنٹرل جیل میں پھانسی۔

اپریل ۱۹۳۱ء : گورنمنٹ کالج لاہور سے بی، اے اور عربی میں آنرز کیا۔

۱۹۳۳ء : والد کا انتقال۔
بقول فیض : اس وقت تک ہم رئیس تھے۔ یکایک ہم قلاش ہو گئے۔ کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا سوائے زمین کی آمدنی کے۔

جولائی ۱۹۳۳ء : ایم۔ اے (انگریزی) گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا۔

۱۹۳۴ء : اورنٹیل کالج لاہور سے ایم۔ اے (عربی) فرسٹ کلاس میں کیا۔

۱۹۳۵ء : مسلم اینگلو اورنٹیل کالج میں انگریزی کے لیکچرار ۱۲۵ روپے ماہوار۔ یہاں پر چھ سال نوکری کی۔
کارل مارکس انجیلز کا کمیونسٹ مینی فیسٹو پڑھا۔
پروفیسر محمود الظفر اور ان کی بیوی ڈاکٹر رشید جہاں کے اصرار پر۔ دونوں اسی کالج میں پڑھاتے تھے۔
ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر اس کالج کے پرنسپل اور محمود الظفر وائس پرنسپل تھے۔ پطرس بخاری اور ہاجرہ بیگم سے بھی ملاقات اسی کالج میں ہوئی۔

۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء :	ترقی پسند تحریک کی بنیاد، لکھنؤ کانفرنس، رفاہِ عام کلب میں منشی پریم چند کا خطبۂ صدارت "ادب کی غرض و غایت" جو ماہنامہ "زمانہ" کے اپریل ۱۹۳۷ء کے شمارہ میں چھپا۔ فیض کی سجاد ظہیر کے ساتھ کانفرنس میں شرکت۔
جولائی ۱۹۳۶ء :	گورنمنٹ کالج لاہور میں مشاعرہ، جہاں فیض نے اپنی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" پڑھی علامہ اقبال نے بلا کر فیض کو بہت داد دی اور پیشین گوئی کی کہ فیض آگے چل کر بہت بڑا شاعر بنے گا۔
دسمبر ۱۹۳۶ء :	دلّی میں ترقی پسند کل ہند کنونشن میٹنگ۔ فیض کی شرکت۔
اپریل ۱۹۳۷ء :	امرتسر میں پنجاب کے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس۔ ایم، اے، او کالج والوں نے ہال دینے سے انکار کیا آخر کار کسان ہال امرتسر میں جہاں پنجاب کے کسانوں کی کانفرنس ہو رہی تھی، ترقی پسند کانفرنس منعقد ہوئی۔
جولائی ۱۹۳۷ء :	صوبائی خود مختاری مقبول حکومت کا قیام۔
۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء :	علامہ اقبال کا انتقال۔ اور فیض کی ماتمی تقریر۔ لاہور۔
جولائی ۱۹۳۸ء :	رسالہ "ادبِ لطیف" کے مدیر بنے۔
دسمبر ۱۹۳۸ء :	ترقی پسند مصنفین کا دوسرا کل ہند سالانہ اجلاس کلکتہ میں۔

سنہ ۱۹۳۹ء	:	فیض کی شاعری کا پہلا مجموعہ "نقش فریادی"
سنہ ۱۹۳۹ء	:	لاہور ریڈیو اسٹیشن سے ان کے ڈرامے، مثلاً پرائیویٹ سیکریٹری، سانپ کی چھتری، تماشہ مرے آگے، نشر ہوئے۔
سنہ ۱۹۴۰ء	:	ہیلی کالج آف کامرس میں انگریزی کے لیکچرار کی حیثیت سے۔
۷ر اگست سنہ ۱۹۴۱ء	:	رابندر ناتھ ٹیگور کا کلکتہ میں انتقال۔
۲۸ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ء	:	لندن کی دوشیزہ ایلیس کیتھرن جارج سے شادی۔ مس ایلیس ڈاکٹر تاثیر کی بیوی کی چھوٹی بہن ہیں۔ منگنی امرتسر میں اور شادی سری نگر (کشمیر) میں اسلامی رسم و رواج سے ہوئی۔ نکاح شیخ محمد عبداللہ نے پڑھوایا۔ بخشی غلام محمد اور دیگر لوگ شادی میں آئے۔ ایلیس کا اسلامی نام کلثوم رکھا گیا۔ سلیمہ اور منیرہ دو لڑکیاں ہیں۔ سلیمہ سنہ ۱۹۴۲ء میں اور منیرہ سنہ ۱۹۴۵ء میں پیدا ہوئیں۔
سنہ ۱۹۴۲ء	:	انگریزی فوج میں نوکری کیپٹن کی حیثیت سے۔ محکمہ تعلقات عامہ کے جنگ کی پبلسٹی اور پروپیگنڈہ ونگ میں۔ نام فیض احمد فیض فوجی کاغذات میں اتفاقاً لکھا گیا۔ پھر اسی نام سے یاد کیے گئے۔
دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء	:	انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند تیسری کانفرنس دلی میں فیض نے فوجی وردی میں اس کانفرنس میں

شرکت کی ٹاؤن ہال چاندنی چوک۔ دہلی

سنہ ۱۹۴۳ء : فیض میجر بنے۔ جنرل کلاڈ آکنک کے ساتھ دورے کیے۔ انگریزی کی جنگ کی پبلسٹی کی۔

دسمبر سنہ ۱۹۴۳ء : کل ہند ترقی پسند مصنفین کی چوتھی کانفرنس بمبئی میں فیض کی شرکت۔

سنہ ۱۹۴۴ء : لیفٹیننٹ کرنل کے عہدہ پر

سنہ ۱۹۴۵ء : عربک کالج دہلی میں یوم اقبال پر فیض کی تقریر۔ جو اب ڈاکٹر ذاکر حسین کالج ہے۔

اکتوبر سنہ ۱۹۴۵ء : ترقی پسند مصنفین کی پانچویں کل ہند کانفرنس حیدرآباد میں۔ مسز سروجنی نائیڈو کی صدارت میں۔

سنہ ۱۹۴۶ء : فوجی خدمات کی خاطر ایم۔ بی۔ ای کا خطاب۔ اچھے کام کی وجہ سے انگریزی تمغہ۔

دسمبر سنہ ۱۹۴۶ء : فوجی ملازمت سے استعفیٰ۔

یکم جنوری سنہ ۱۹۴۷ء : استعفیٰ منظور ہوا۔ لاہور واپس چلے آئے۔

۲ فروری سنہ ۱۹۴۷ء : پاکستان ٹائمز (انگریزی) امروز (اردو) اور ہفت روزہ "لیل و نہار" کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے۔ یہ تینوں پرچے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے تحت شایع کیے گئے۔

۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء : ہندوستان کی آزادی اور تقسیم۔
"صبح آزادی" نظم کی اشاعت۔

جنوری ۱۹۴۸ء : فیض ایک دن کے لیے گرفتار ہوئے ایک خبر چھاپنے پر۔

۳۰؍جنوری ۱۹۴۸ء : مہاتما گاندھی کی شہادت کے بعد فیض دہلی میں۔

۱۹۴۸ء : محمد علی جناح صدر پاکستان کا انتقال۔

۲۷؍مئی ۱۹۴۹ء : کل ہند ترقی پسند ادیبوں کی چھٹی کانفرنس بھیونڈی (بمبئی) میں۔

ستمبر ۱۹۴۹ء : پاکستان میں ترقی پسند ادیبوں کی دوسری کانفرنس لاہور میں۔

دسمبر ۱۹۴۹ء : سان فرانسسکو اور جنیوا میں انٹرنیشنل لیبر کانفرنس میں۔

۹؍مارچ ۱۹۵۱ء : راولپنڈی سازش کیس۔
چار سال ایک ماہ گیارہ دن کی سزا۔ جنرل ایوب کی سرکار کا تختہ الٹنے کے کیس میں ڈیڑھ درجن سیاسی لیڈر فوجی افسران کے ساتھ فیض احمد فیض کو جو اس وقت پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر تھے، گرفتار کرایا گیا۔ سرگودھا، لائل پور، منٹگمری، حیدرآباد اور بھیر (سندھ) ۔۔۔ لاہور کی جیلوں میں۔ دو بار کراچی کے ہسپتال میں رکھا گیا علاج کے لیے۔ ۲۰؍اپریل ۱۹۵۵ء کو جیل سے رہائی۔

۱۸؍اگست ۱۹۵۱ء : ایلیس کے نام خط۔

۱۹۵۲ء : "دستِ صبا" فیض کا دوسرا مجموعہ۔ دورانِ جیل۔

۱۸؍جولائی ۱۹۵۲ء : بھائی کا انتقال۔ فیض حیدرآباد (سندھ) کی جیل میں تھے۔

۰؍اگست ۱۹۵۲ء : ڈاکٹر رشید جہاں کی موت ماسکو میں۔

مئی ۱۹۵۴ء : ڈاکٹر رادھا کرشنن کی کتاب "ہندوستانی فلسفہ" اور دیگر تراجم ہندو فلسفہ" پر پڑھے۔ کالی داس، سورداس، تلسی داس، کبیر، ملک محمد جائسی، خان خاناں کو ہندی میں پڑھا۔

۱۸؍جنوری ۱۹۵۵ء : سعادت حسن منٹو کی میو ہسپتال میں موت۔

۲۰؍اپریل ۱۹۵۵ء : فیض کی جیل سے رہائی۔

مئی ۱۹۵۵ء : یوم اقبال کے موقع پر دہلی میں راجہ غضنفر علی خاں، پاکستانی سفیر کے گھر میں مشاعرہ میں شرکت کی۔ صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن اور وزیر اعظم پنڈت نہرو سے بھی ملے۔

۱۹۵۶ء : "زنداں نامہ" فیض کا تیسرا مجموعہ کلام شائع ہوا۔

۱۹۵۶ء : فیض کی نظم "ترانہ" کا ترجمہ چو نکولائی گلیوف اور سرگئی لیوزمیف نے کیا اور ماسکو لٹریری گزٹ میں شائع

ہوا۔ اسی سال فیض کی ۲۸ مشہور نظموں کا ترجمہ روسی زبان میں شایع ہوا۔ ان میں "متاعِ لوح و قلم" "اقبال" "زنداں کی ایک شام" "ایرانی طلبا کے نام" اور "دستِ صبا" اور دوسری نظمیں شامل ہیں۔

سنہ ۱۹۵۶ء : چین کا دورہ۔

سنہ ۱۹۵۷ء : فیض پر انگریزی میں پہلی کتاب۔ انتخاب اور ترجمہ: وی۔ جی۔ کیرنین۔

اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء : سوویٹ یونین کا پہلا دورہ۔
تاشقند میں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس۔ ازبک، تاجک، قزاخ، کرغیز، آذربائی جان، ترکمانی زبانوں میں فیض کی شاعری۔

دسمبر سنہ ۱۹۵۸ء : واپسی پر کراچی (پاکستان) میں دوبارہ گرفتاری۔
پاکستان سیفٹی ایکٹ کے تحت چھ مہینے کی اور جیل
مارشل لا عائد۔ پاکستان ٹائمز کے دفتر پر تالابندی۔

اپریل سنہ ۱۹۵۹ء : جیل سے رہائی۔
پاکستان ٹائمز پر گورنمنٹ کا قبضہ۔
چیف ایڈیٹر بننے کی پیش کش ٹھکرا دی۔
پیش کش سی۔ آئی۔ ڈی کے آفیسر اور فیض کے کلاس فیلو نذیر رضوی لے کے آئے تھے۔

اپریل سنہ ۱۹۵۹ء : پاکستان آرٹ کونسل لاہور کے سیکریٹری بنے۔
جون سنہ ۱۹۶۲ء تک۔

اگست ۱۹۵۹ء :	فیض کے کلام کا لتھوانیا کی زبان میں ترجمہ۔
اپریل ۱۹۶۰ء :	فیض کے تین مجموعوں "نقش فریادی" "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" کے اہم حصّوں کا مجموعہ ماسکو میں شایع ہوا۔ رُوسی زبان میں ترجمہ رُوس کے ممتاز شعراء نے کیا۔
فروری ۱۹۶۲ء :	"میزان"۔ تنقیدی مضامین کی اشاعت۔ (پطرس، تاثیر، حسرت محمود اور رشید جہاں کی یادیں)
۲۷ اگست ۱۹۶۲ء :	لینن پیس پرائز، ماسکو میں فنکشن۔ فیض پہلے ایشیائی شاعر تھے جنھیں یہ پرائز ملا اس موقع پر فیض کی تقریر۔
ستمبر ۱۹۶۲ء :	پا بلو نرودا کے ساتھ ایک مہینہ سوچی کے صحت افزا مقام پر۔ لینن گراڈ میں سارتر سے ملاقات۔
اکتوبر ۱۹۶۲ء سے مارچ ۱۹۶۴ء تک :	لندن میں قیام، ہنگری، کیوبا، لبنان، مصر، لنکا اور الجیریا کا دورہ۔
یکم اپریل ۱۹۶۴ء :	سرعبداللہ ہارون کالج کراچی میں پرنسپل کی حیثیت سے۔
۱۹۶۵ء :	فیض کے کلام کا چوتھا مجموعہ "دستِ تہِ سنگ"۔
۱۴ مئی ۱۹۶۵ء :	"افکار" کا فیض نمبر۔ ۷۷۶ صفحات پر مشتمل۔

نومبر ۱۹۶۵ء	:	ہند پاک جنگ کے موقعہ پر فیض کا گیت " اٹھو اب ماٹی سے اب اٹھو میرے لال "
۱۹۶۷ء	:	سوویٹ یونین کا تیسرا دورہ ماسکو تاشقند، سمرقند، بخارا، کوہ قاف
اپریل ۱۹۶۸ء	:	فیض کی فلم علامہ اقبال پر
مئی ۱۹۶۸ء	:	فیض کمیٹی پاکستانی کلچر کے بارے میں
ستمبر ۱۹۶۸ء	:	فیض نے کراچی میں ادارہ یادگارِ غالب قائم کیا
اکتوبر ۱۹۶۸ء	:	"دستِ صبا" اور "نقشِ فریادی" کا دسواں ایڈیشن
۱۹۷۱ء	:	فیض کی ساٹھویں سالگرہ منائی گئی۔
۱۹۷۱ء	:	فیض کے خطوط "صلیبیں میرے دریچے میں"۔
۱۹۷۱ء	:	فیض کا پانچواں مجموعہ "سروادیِ سینا"
۱۹۷۲ء	:	فیض پاکستانی قومی ادبی اکاڈمی کے صدر منتخب ہوئے۔
جون ۱۹۷۳ء	:	الما آتا (سوویٹ یونین) میں افرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں۔
اکتوبر ۱۹۷۳ء	:	ماسکو سے دہلی میں سجاد ظہیر کی لاش کے ساتھ۔

اکتوبر ۱۹۷۳ء :	سفرنامہ کیوبا (نثر)
نومبر ۱۹۷۳ء :	متاعِ لوح و قلم کی اشاعت، فیض کے نثری مضامین۔
دسمبر ۱۹۷۳ء :	اسپیشل ایڈیشن انڈونیشیا اور فلپائن کا دورہ۔
۱۹۷۶ء :	ہماری قومی ثقافت (نثر) کی اشاعت
۱۹۷۷ء :	ڈاکٹر ایوب مرزا کی کتاب "ہم جو ٹھہرے اجنبی" فیض سے مختلف ملاقاتوں میں سوالات کے جواب۔
۱۹۷۸ء :	فیض کا چھٹا مجموعہ "شامِ شہرِ یاراں"
۱۹۷۸ء :	نئی دہلی میں افرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں پاکستان کے نمایندے کی حیثیت سے۔
۱۵/ اگست ۱۹۷۸ء :	فیض کے اعزاز میں لکھنؤ قیصر باغ بارہ دری میں اتر پردیش اکاڈمی کی طرف سے عوامی استقبالیہ جلسہ
۱۵-۱۶/ ستمبر ۱۹۷۸ء :	فیض بھوپال میں۔
نومبر، دسمبر ۱۹۷۸ء :	کینیڈا، ہوائی اور ماسکو کا دورہ۔
۱۹۷۹ء :	ماسکو سے یادوں کا مجموعہ (نثر) "مہ و سالِ آشنائی" کی اشاعت۔

۱۹۷۹ء :	بیروت میں انگریزی میگزین " لوٹس " کے مدیر کی حیثیت سے۔
ستمبر ۱۹۸۰ء :	فیض کلکتہ میں۔ ستیہ جیت رے سے ملاقات۔
نومبر ۱۹۸۰ء :	فن اور شخصیت (بمبئی) کا ۶۸۰ صفحات کا فیض نمبر۔
۱۹۸۱ء :	فیض کا ساتواں مجموعہ "مرے دل مرے مسافر"
اپریل ۱۹۸۱ء :	جشن فیض ہندوستان میں۔ چنڈی گڑھ، دہلی، لکھنؤ، الٰہ آباد، بھوپال، اور بمبئی میں۔
۱۹۸۲ء :	بیروت سے کراچی واپسی مختلف اخبارات سے انٹرویو۔
۱۲-۱۶ اپریل ۱۹۸۲ء :	ایشیائی ادیبوں کی ٹوکیو (جاپان) میں میٹنگ۔ دالشن رائٹرز فورم فیض کی شرکت۔
جولائی ۱۹۸۴ء :	لندن یونیورسٹی میں فیض سیمنار جس میں فیض صاحب خود شریک ہوئے۔
۱۴ نومبر ۱۹۸۴ء ۔	فیض کی آخری پریس کانفرنس، لاہور۔

۱۰ نومبر ۱۹۸۴ء : اپنے آبائی گاؤں کالا قادر کی مسجد میں ایک لوح کی نقاب کشائی، جس پر انھیں کی ایک نظم کھدوائی گئی۔

۱۸ نومبر ۱۹۸۴ء : دل کا شدید دورہ۔ سیالکوٹ سے لاہور لائے گئے۔ میو ہسپتال میں داخل۔

۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء : ایک بج کر پندرہ منٹ پر لاہور کے میو ہسپتال میں وفات۔

۲۷ نومبر ۱۹۸۴ء : اسلام آباد (پاکستان) میں دفنائے گئے۔

OO

فیض کی آخری غزل

کہ لطف کیا ہے مرے مہرباں ستم کیا ہے
بہت ملا نہ ملا زندگی سے، غم کیا ہے

اجل کے ہاتھ کوئی آ رہا ہے پروانہ!
نہ جانے آج کی فہرست میں رقم کیا ہے

ہم ایک عمر سے واقف ہیں اب نہ سمجھاؤ
متاعِ درد بہم ہے، تو بیش و کم کیا ہے

کرے نہ جگ میں الاؤ تو شعر کس مقصد
کرے نہ شہر میں جل تھل تو چشمِ نم کیا ہے

سجاؤ بزم، غزل گاؤ، جام تازہ کرو
بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے

فیض کا آخری قطعہ

رفیقِ راہ تھی منزل ہر اک تلاش کے بعد!
چھٹا یہ ساتھ تو رہ کی تلاش بھی نہ رہی
ملول تھا دلِ آئینہ ہر خراش کے بعد
جو پاش پاش ہوا، اک خراش بھی نہ رہی

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے
— فیض

کتابیات

۱۔	نقشِ فریادی	فیض احمد فیض	۱۹۳۹ء
۲۔	دستِ صبا	فیض احمد فیض	۱۹۵۲ء
۳۔	زنداں نامہ	فیض احمد فیض	۱۹۵۶ء
۴۔	میزان (تنقیدی مضامین)	فیض احمد فیض	۱۹۶۲ء
۵۔	دستِ تہہ سنگ	فیض احمد فیض	۱۹۶۵ء
۶۔	صلیبیں مرے دریچے میں (ایلیس کے نام خطوط)	فیض احمد فیض	۱۹۷۱ء
۷۔	سرِ وادیِ سینا	فیض احمد فیض	۱۹۷۱ء

۸- متاعِ لوح و قلم	فیض احمد فیض	۱۹۷۳ء
۹- ہماری قومی ثقافت (نثر)	فیض احمد فیض	۱۹۷۶ء
۱۰- شامِ شہرِ یاراں	فیض احمد فیض	۱۹۷۸ء
۱۱- مہ و سالِ آشنائی (نثر)	فیض احمد فیض	۱۹۷۹ء
۱۲- مرے دل مرے مسافر	فیض احمد فیض	۱۹۸۱ء
۱۳- سفرنامہ کیوبا (نثر)	فیض احمد فیض	۱۹۸۳ء
۱۴- "افکار" کراچی فیض نمبر	ترتیب: صہبا لکھنوی	۱۹۶۵ء
۱۵- اُردو تنقید کا نیا محاورہ	ڈاکٹر عتیق اللہ	۱۹۸۴
۱۶- "ہم کہ ٹھہرے اجنبی"	ڈاکٹر ایوب مرزا	۱۹۷۷ء
۱۷- فیض (ہندی)	شمشیر بہادر سنگھ اور مغیث الدین فریدی (راج کمل پرکاشن، نئی دہلی)	۱۹۷۹ء
۱۸- ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری (انجمن ترقی اُردو ہند، علی گڑھ)	۱۹۵۱ء
۱۹- ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ (۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۶ء تک)	ڈاکٹر صادق، نئی دہلی	۱۹۸۱ء
۲۰- اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی، علی گڑھ	۱۹۷۲ء
۲۱- روشنائی	سید سجاد ظہیر، آزاد کتاب گھر، دہلی	۱۹۵۴ء

۲۲- ترقی پسند ادب | عزیز احمد، حیدر آباد | ۱۹۴۵ء

۲۳- ترقی پسند ادب، ایک جائزہ | ہنس راج رہبر | ۱۹۶۷ء

۲۴- اُردو ادب میں رومانوی تحریک | ڈاکٹر محمد حسن، علی گڑھ | ۱۹۵۵ء

۲۵- روایت اور بغاوت | سید احتشام حسین | ۱۹۴۷ء
ادارہ اشاعت اُردو، حیدر آباد (دکن)

۲۶- انگارے | مرتبہ: سید سجاد ظہیر، لکھنؤ | ۱۹۳۲ء

۲۷- اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ | سلیم اختر، لاہور | ۱۹۷۵ء
(اشاعتِ چہارم)

۲۸- اقبال کی کہانی | جگن ناتھ آزاد | ۱۹۸۰ء
(ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی)

۲۹- پاکستانی کلچر | جمیل جالبی | ۱۹۶۵ء
مشتاق بک ڈپو، کراچی

۳۰- پاکستان منزل بہ منزل | شریف الدین پیرزادہ | ۱۹۷۵ء

۳۱- نقدِ فیض | نسیم عباسی | ۱۹۷۸ء
بک سروس، جامعہ نگر، دہلی

۳۲- ہماری آزادی | ابوالکلام آزاد، کلکتہ | ۱۹۴۱ء

۳۳- ادبِ لطیف، لاہور (رسالہ) | سالنامہ | ۱۹۴۱ء

۳۴- ساقی، لاہور (رسالہ) | جوبلی نمبر | ۱۹۵۵ء

۳۵- زمانہ، کان پور (رسالہ) | جنوری ۱۹۳۶ء تا اپریل ۱۹۳۷ء

۳۶ - مضامینِ پریم چند — ڈاکٹر قمر رئیس

۳۷ - علی سردار جعفری (شخصیت اور شاعری) — ایوب واقف، ادارہ فروغِ اردو، لکھنؤ — ۱۹۸۴ء

۳۸ - تنقیدی جائزے — احتشام حسین، الہ آباد پبلشنگ ہاؤس، — ۱۹۵۱ء

۳۹ - مختصر تاریخ زبانِ اردو — غلام حسین، اے، شاہ اینڈ کمپنی، کراچی — ۱۹۵۲ء

۴۰ - نیا ادب — کرشن پرشاد کول، انجمن ترقی اردو، کراچی — ۱۹۴۹ء

۴۱ - نظمِ جدید کی کروٹیں — ڈاکٹر وزیر آغا، ادبی دنیا، لاہور — ۱۹۶۳ء

۴۲ - جدید اردو شاعری — ڈاکٹر عبادت بریلوی، اردو دنیا، کراچی — ۱۹۶۱ء

۴۳ - ادبی اشارے — ڈاکٹر سلام سندیلوی، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور — ۱۹۶۴ء

۴۴ - فیض کی شاعری — دیویندر اسر، شاہراہ، دہلی۔ — ۱۹۵۴ء

۴۵ - فیض کی شاعری پر ایک نظر — تاجور سامری، جوار بھاٹا، دہلی — ۱۹۶۲ء

۴۶ - فیض سے ایک انٹرویو — شمس کنول
'فن کار' بمبئی — ۱۹۵۷ء

۴۷ - فیض، شاعرِ امن — ممتاز حسین
فارن لٹریچر، ماسکو — ۱۹۶۲ء

۴۸ - اُردو شاعری کے چند مسئلے — سجاد ظہیر
'عوامی دور' دہلی — ۱۹۶۳ء

۴۹ - ادب و شعور — ممتاز حسین
اُردو اکیڈمی، سندھ، کراچی — ۱۹۶۲ء

۵۰ - اُردو کی عشقیہ شاعری — فراق گورکھپوری
سنگم پبلشنگ ہاؤس، الٰہ آباد — ۱۹۴۵ء

۵۱ - فیض احمد فیض سے ملاقات — فضل امام (۲۸ نومبر ۱۹۸۰ء کو کینیڈا میں)
چنگاری، دہلی۔ شمارہ ۱، ۱۴

۵۲ - فیض احمد فیض سے ملاقات — شفیع عقیل
(۲۷ نومبر ۱۹۸۲ء کو کراچی میں محترمہ بیگم مجید ملک کے گھر پر)
چنگاری، دہلی، شمارہ ۱، ۱۷

۵۳ - نیا آہنگ (مجموعۂ کلام) — اختر الایمان
رخشندہ کتاب گھر، بمبئی — ۱۹۷۷ء

۵۴ - "فن اور شخصیت" فیض نمبر، بمبئی — ترتیب: صابر دت، سلمیٰ صدیقی — ۱۹۸۰ء

ضمیمہ : ایک

فیض کا خط ـــــ اپنی بیوی کے نام

(جیل سے)

۱۸ / اگست ۱۹۵۱ء

جانِ من !

مجھے افسوس ہے کہ میں تمھارے خط کا جواب، جو مجھے چار روز قبل موصول ہوا تھا تاخیر سے دے رہا ہوں مجھے اُمید ہے کہ تمھیں اس دوران میں میرا آخری خط مِل گیا ہوگا۔ مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ تمھاری مکان کی پریشانی بالآخر دُور ہو گئی۔ ان تمام پریشانیوں اور مسائل سے اُلجھنے کے لیے تمھیں تنہا چھوڑ کر میں خود کو مجرم محسوس کرتا ہوں۔ لیکن شاید اس میں بھی بہتری کی کوئی صورت ہو۔ جب تک لوگوں کو مصائب کا سامنا نہ ہو، ان سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ پھر بھی میری خواہش ہے کہ کاش میں تمھیں ان سے نمٹنے کے لیے تنہا نہ چھوڑتا۔ بلکہ ہم دونوں مل کر تمام مشکلات کا سامنا کرتے۔ بہرحال ہمت رکھو تمام پریشانیاں جلد ہی دُور ہو جائیں گی۔ زندگی میں بے شمار ایسی باتیں ہیں جن کے لیے انسان زندہ رہنے کی تمنا کرتا رہتا ہے۔ یہ درست ہے کہ انسان ہمیشہ جوان نہیں رہتا اور ضعیفی سے پہلے کے چند سال بیش بہا ہوتے ہیں لیکن مجھے اُمید ہے کہ ہمیں ان چند سالوں کو اچھی طرح گزارنے کا موقع ضرور ملے گا۔

یہ دیکھ کر کہ یہاں کے نوجوان میرا بے حد ادب و احترام کرتے ہیں مجھے ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ خاص طور پر اس نوجوان کپتان کا جذبہ واحترام دیکھ کر جسے میں قرآن پڑھاتا ہوں۔ چونکہ یہاں کے مختصر سے حلقہ میں لوگ فوجی عہدوں کی بابت زیادہ توجہ نہیں

دیتے۔ اس لیے ہر ایک سے یہی اُمید کی جاتی ہے کہ وہ اپنا کام خود کرے لیکن یہاں بھی مجھے یہ سہولت حاصل ہے کہ مجھے سگریٹ یا ایک گلاس پانی کے لیے اُٹھنا نہیں پڑتا۔ اس کا ایک افسوس ناک پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ میری وہ تمام اچھی عادتیں جو میں نے لائل پور جیل میں بنائی تھیں تیزی سے چھوٹتی جا رہی ہیں اور میں پہلے کی مانند بنتا جا رہا ہوں۔ امی نے تم سے غلط کہا ہے کہ میں دُبلا ہو گیا ہوں۔ ہماری ملاقات رات گئے ہوئی تھی اور ممکن ہے انھیں یہ مغالطہ اس بنا پر ہوا ہو کہ ہم انتہائی کشیدہ ماحول میں ملتے۔ انھیں یہ گمان تھا کہ مجھے ان سے کوئی گلہ ہے اس لیے وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگے اور تم جانو صفائی پیش کرنے کا فعل مجھے بے حد بور کرتا ہے۔ چونکہ مجھے کچھ زیادہ نہیں کہنا تھا اس لیے ہماری ملاقات جیسی خوش گوار ہونی چاہیے تھی نہ ہو سکی جس کا مجھے رنج ہے۔ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ میری صحت بالکل اچھی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میرا وزن بڑھ رہا ہے اور وہ دس پونڈ وزن جو لائل پور جیل میں کم ہو گیا تھا واپس مل رہا ہے۔

البتہ یہ بات یقیناً پریشانی کی ہے کہ ہم گنجے ہوتے جا رہے ہیں۔ چونکہ یہاں گرد زیادہ ہے اور میرے بالوں کی حالت جو عام طور پر خراب رہتے ہیں بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ اس وقت تک جب میں جیل سے باہر نکلوں میں اپنی جنسی کشش بالکل کھو چکا ہوں گا جو یقیناً قابلِ رحم حالت ہوگی۔ اس لیے کہ پھر اسکینڈل پھیلانے والے کیونکر میرے متعلق افواہ پھیلا سکیں گے۔ ایک بوڑھے اور گنجے سے کوئی اسکینڈل منسوب کرنا بلا شبہ دشوار ہوگا

امی اور آبا کا بڑا پیارا خط ملا ہے۔ یہ خط میرا خط پہنچنے سے قبل لکھا گیا ہے۔ بہر حال اب انھیں میرا خط مل گیا ہوگا۔ تمھیں فرصت ہو تو میرے خط کا انتظار کیے بغیر مجھے خط لکھتی رہا کرو۔ میرے پاس تو تمھیں بتانے کے لیے نئی نئی باتیں یا خبریں ہوتی نہیں لیکن میں تمھاری خیریت اور کبوتروں کی بابت معلوم کرنے کے لیے بے تاب رہتا ہوں۔ یہ جان کر کہ وہ کیا کر رہے ہیں مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے کیونکہ میں ان کا تصور کر لیتا ہوں اور اس طرح ان کا قرب محسوس کرنے لگتا ہوں۔

اب یہ بات یقینی ہے کہ یہ مقدمہ چار پانچ ماہ چلتا رہے گا۔ لہٰذا تم اپنے آنے کے پروگرام میں اسی کے مطابق ردو بدل کر سکتی ہو۔ نوازش نے مجھ سے کہا ہے کہ طفیل ستمبر میں آنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ آتے ہیں تو تم بھی ان کے ساتھ آ سکتی ہو۔ مجھے کتابیں مل گئی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ کتابیں یہاں پہنچ چکی ہیں اور مجھے جلد ہی مل جائیں گی۔ میں نے حیدر کو لکھا ہے کہ میرے پاس 'امروز' اور 'پاکستان ٹائمز' بھیج دیا کرے کیونکہ مجھے انھیں منگوانے کی اجازت مل گئی ہے اور میں بے چینی سے ان کا انتظار کر رہا ہوں۔ اگر انھوں نے بھیجنا شروع نہیں کیا تو تم کہہ کر جلد بھجوا دو۔

سب تک میرا پیار پہنچا دو اور دلچسپ معصوم چہروں کو میری جانب سے چوم لو۔ زیادہ پیار قبول کرو میری کو آبا کی جانب سے سالگرہ کی مبارکباد پہنچے۔

فیض

ضمیمہ : دو

ڈاکٹر رشید جہاں کی موت پر

جیل سے ایلیس فیض کے نام اپنے خط نمبر ۷۴ مورخہ ۹ راگست ۱۹۵۲ء میں فیض لکھتے ہیں :

"رشیدہ کے ماسکو میں مرنے کی خبر کل پڑھی - اگر میں جیل سے باہر ہوتا تو شاید زار وقطار روتا لیکن اب تو رونے کو آنسو ہی باقی نہیں رہے - اس حادثے کا سن کر رونے دھونے کے بجائے دل پر عجیب مردنی سی چھائی رہی - شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب کے موت رات کے رہزن کی طرح اچانک اور بے اطلاع نہیں آئی تھی یا شاید اپنے لاشعور میں یہ خیال بھی ہو کہ مرنے والی کی بہادر روح بے کار اور بزدلانہ غم و اندوہ کو پسند نہیں کرے گی -

جب سے اس کی مہلک بیماری کا سنا تھا دل میں بہت شدت سے تمنا تھی کہ کاش وہ ہمارے باہر آنے تک زندہ رہے اور ہم سب ساتھ اس سے ملنے کے لیے جا سکیں - اسے بچوں سے بہت پیار تھا - میں اکثر سوچتا تھا کہ ہمارے بچوں کو دیکھے گی تو کتنا خوش ہو گی - افسوس کہ موت کے خلاف اس کی طویل جنگ اتنی جلد ختم ہو گئی - اس کے جانے سے ہمارے برصغیر سے نیکی اور انسان دوستی کی بہت بڑی دولت چھن گئی اور اس کے دوستوں کی محرومی کا کیا کہیے جن کی زندگیاں اس کے ایثار و مروت سے اس قدر آسودہ اور مزین ہیں -

(صلیبیں مرے دریچے میں - ص ۸۰)

ضمیمہ : تین

فیض احمد فیض کی تقریر

فیض صاحب کی تقریر جو انھوں نے ماسکو میں بین الاقوامی لینن امن انعام کی پرشکوہ تقریب کے موقع پر اردو زبان میں کی۔
(ماسکو، ۲۰ر اگست ۱۹۶۲ء)

محترم اراکینِ مجلس صدارت، خواتین اور حضرات!

الفاظ کی تخلیق و ترتیب شاعر اور ادیب کا پیشہ ہے لیکن زندگی میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب یہ قدرتِ کلام جواب دے جاتی ہے۔ آج عجزِ بیان کا ایسا ہی مرحلہ مجھے درپیش ہے۔ ایسے کوئی الفاظ میرے ذہن میں نہیں آرہے ہیں جن میں اپنی عزت افزائی کے لیے لینن پرائز کمیٹی سوویٹ یونین کے مختلف اداروں، دوستوں اور آپ سب خواتین و حضرات کا شکریہ خاطر خواہ طور سے ادا کرسکوں۔ لینن امن انعام کی عظمت تو اسی ایک بات سے واضح ہے کہ اس سے لینن کا محترم نام اور مقدس لفظ وابستہ ہے لینن جو دورِ حاضر میں انسانی حریت کا سب سے بزرگ علم بردار ہے اور امن جو انسانی زندگی اور اس زندگی کے حسن و خوبی کی شرطِ اول ہے مجھے اپنی تحریر و عمل میں ایسا کوئی کام نظر نہیں آتا جو اس عظیم اعزاز کے شایانِ شان ہو۔ لیکن اس عزت بخشی کی ایک وجہ ضرور ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس تمنا اور آدرش کے ساتھ مجھے اور میرے ساتھیوں کو وابستگی رہی ہے یعنی امن اور آزادی کی تمنا وہ بجائے خود اتنی عظیم ہے کہ اس واسطے

سماں کے حقیر اور ادنیٰ کارکن بھی عزت اور اکرام کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

یوں تو ذہنی طور سے مجنوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سبھی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور سبھی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، اور دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم اور مصور کا موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے یعنی شعور اور ذہانت، انصاف اور صداقت، وقار اور شجاعت، نیکی اور رواداری، اس لیے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوش مند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونی چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے یوں نہیں ہے۔ اس لیے نہیں ہے کہ انسانیت کی ابتدا سے اب تک ہر عہد اور ہر دور میں متضاد عوامل اور قوتیں برسر عمل اور برسر پیکار رہے ہیں۔ یہ قوتیں ہیں تخریب و تعمیر، ترقی اور زوال، روشنی اور تیرگی، انصاف دوستی اور انصاف دشمنی کی قوتیں، یہی صورت آج بھی ہے اور اسی نوعیت کی کشمکش آج بھی جاری ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ آج کل انسانی مسائل اور گزشتہ دور کی انسانی الجھنوں میں کئی نوعیتوں سے فرق بھی ہے۔ دورِ حاضر میں جنگ سے دو قبیلوں کا باہمی خون خرابہ مراد نہیں ہے نہ آج امن سے خون خرابے کا خاتمہ مراد ہے۔ آج کل جنگ اور امن کے معنی ہیں آدم کی بقا اور فنا ——— بقا اور فنا دو الفاظ پر انسانی تاریخ کے خاتمے یا تسلسل کا دارومدار ہے انھیں پر انسانوں کی سرزمین کی آبادی اور بربادی کا انحصار ہے۔ یہ پہلا فرق ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اب سے پہلے انسانوں کو فطرت کے ذخائر پر اتنی دسترس اور پیداوار کے ذرائع پر اتنی قدرت نہ تھی کہ ہر گروہ اور برادری کی ضرورتیں پوری طرح سے تسکین پا سکتیں۔ اس لیے آپس میں چھین جھپٹ اور لوٹ مار کا کچھ نہ کچھ جواز بھی موجود تھا لیکن اب صورت یہ نہیں ہے۔ اب انسانی عقل، سائنس اور صنعت کی بدولت اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ جس میں سب تن بخوبی پل سکتے ہیں اور سبھی جھولیاں بھر سکتی ہیں۔ بشرطیکہ قدرت کے یہ بے بہا ذخائر پیداوار کے بے اندازہ خرمن بعض اجارہ داروں اور مخصوص طبقوں کی تسکین ہوس کے لیے نہیں، بلکہ جملہ انسانوں کی بہبود کے لیے کام میں لائے جائیں۔ اور عقل اور سائنس اور صنعت کی کل ایجادیں اور صلاحیتیں تخریب کی بجائے تعمیری منصوبوں میں صرف ہوں لیکن یہ جبھی ممکن ہے کہ انسانی معاشرے میں ان مقاصد سے مطابقت پیدا ہو اور انسانی معاشرے کے ڈھانچے کی بنائیں ہوس، استحصال اور اجارہ داری کے بجائے انصاف، برابری آزادی اور اجتماعی خوش حالی پر اٹھائی جائیں۔ اب یہ ذہنی اور خیالی بات نہیں، عملی کام ہے۔ اس عمل میں امن کی جدوجہد اور آزادی کی جدوجہد کی حدیں آپس میں مل جاتی ہیں اس لیے کہ امن کے دوست اور دشمن اور آزادی کے دوست اور دشمن ایک ہی قبیلے کے لوگ، ایک ہی نوع کی قوتیں ہیں۔ ایک طرف وہ سامراجی قوتیں ہیں جن کے مفاد، جن کے اجارے جبر اور حد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتے اور جنھیں ان اجاروں کے تحفظ کے لیے پوری انسانیت کی بھینٹ بھی قبول ہے۔ دوسری طرف وہ طاقتیں ہیں جنھیں بنکوں اور کمپنیوں کی نسبت انسانوں کی جان زیادہ عزیز ہے جنھیں دوسروں پر حکم چلانے کی بجائے آپس میں ہاتھ بٹانے اور ساتھ مل کر کام کرنے میں زیادہ لطف آتا ہے، سیاست و اخلاق، ادب اور فن، روزمرہ زندگی غرض کئی محاذوں پر، کئی صورتوں میں تعمیر اور تخریب

انسان دوستی اور انسان دشمنی کی یہ چپقلش جاری ہے۔ آزادی پسند اور امن پسند لوگوں کے لیے ان میں سے ہر محاذ اور ہر
صورت پر توجہ دینا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر سامراجی اور غیر سامراجی قوتوں کی لازمی کشمکش کے علاوہ بدقسمتی سے بعض
ایسے ممالک میں بھی شدید اختلافات موجود ہیں جنہیں حال ہی میں آزادی ملی ہے۔ ایسے اختلاف ہمارے ملک پاکستان اور
اور ہمارے سب سے قریبی ہمسایہ ہندوستان میں موجود ہیں بعض عرب ہمسایہ ممالک میں موجود ہیں اور بعض افریقی حکومتوں میں
موجود ہیں۔ ظاہر ہے ان اختلافات سے وہی طاقتیں فائدہ اُٹھا سکتی ہیں جو امن عالم اور انسانی برادری کی دوستی اور
یگانگت کو پسند نہیں کرتیں اس لیے صلح پسند اور امن دوست صفوں میں ان اختلافات کے منصفانہ حل پر غور و فکر
اور اس حل میں امداد دینا بھی لازمی ہے۔

اب سے کچھ دن پہلے جب سوویٹ فضاؤں کا تازہ کارنامہ ہر طرف دُنیا میں گونج رہا تھا تو مجھے بار بار یہ خیال آتا
رہا کہ آجکل جب ہم ستاروں کی دُنیا میں بیٹھ کر اپنی ہی دُنیا کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ تو یہ چھوٹی چھوٹی کمینگیاں، خود غرضیاں
یہ زمین کے چند ٹکڑوں کو بانٹنے کی کوشش اور انسانوں کی چند ٹولیوں پر اپنا سکہ چلانے کی خواہش کیسی بعید از عقل باتیں
ہیں اب جبکہ ساری کائنات کے راستے ہم پر کشادہ ہو گئے ہیں۔ ساری دُنیا کے خزینے انسانی بس میں آ سکتے ہیں تو کیا انسانوں میں
ذی شعور، منصف مزاج اور دیانت دار لوگوں کی اتنی تعداد موجود نہیں ہے جو سب سے منوا سکے کہ یہ جنگی اڈے سمیٹ لو یہ بم اور
راکٹ، توپیں، بندوقیں، سمندر میں غرق کر دو۔ ایک دوسرے پر قبضہ جمانے کے بجائے سب مل کر تسخیر کائنات کو چلو۔ جہاں جگہ
کی کوئی تنگی نہیں ہے۔ جہاں کسی کو کسی سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں لامحدود فضائیں ہیں اور ان گنت دنیائیں۔
مجھے یقین ہے کہ سب رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود ہم لوگ اپنی انسانی برادری سے یہ بات منوا کر رہیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ
انسانیت جس نے اپنے دُشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی۔ اور آخر کار جنگ و نفرت اور
ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنا یہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے
کی تھی:

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل ست

——— "دستِ تہہ سنگ" فروری ۱۹۶۵ء

ضمیمہ : چار

فیض کی آخری پریس کانفرنس

(۱۴ر نومبر ۱۹۸۴ء)

لاہور۔ ۲۵ر نومبر۔ اچھا اور اعلیٰ ادب اُن ممالک میں پیدا ہوتا ہے۔ جہاں زندگی کی کشمکش جاری ہوتی ہے۔ فلسطین اور افریقی ملکوں میں اس وقت اسی وجہ سے اچھے ادب کی تخلیق جاری ہے۔ یورپ میں چونکہ یہ کشمکش نہیں ہے اس لیے وہاں اِن دِنوں اچھا ادب نہیں پیدا ہورہا ہے۔ ان تاثرات کا اظہار ممتاز شاعر فیض احمد فیض نے انتقال سے صرف ۶ دن قبل کیا تھا۔

پاکستانی روزنامہ 'نوائے وقت' کے مطابق فیض نے ۱۴ر نومبر کو لاہور میں فنون لطیفہ اور حالات حاضرہ کے بارے میں اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہماری شعر گوئی پر کوئی قدغن نہیں لگا سکتا۔ حالات کیسے بھی ہوں ہم جیسا چاہیں شعر کہہ سکتے ہیں۔ اس سوال پر کہ کیا موجودہ دور آرٹ کے لیے مناسب ہے؟ فیض نے کہا کہ یہ فن کار پر منحصر ہے اور وہ ناسازگار حالات میں بہترین فن تخلیق کرسکتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ بھی نہ پیدا کرے۔ ایک اور سوال کے جواب میں فیض نے کہا کہ یہ ضروری نہیں کہ زندگی ترقی کرے تو آرٹ ترقی کرے گا۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ آرٹ زندگی کی نمایندگی کرتا ہے۔ انفرادی طور پر آرٹ زندگی سے آگے بھی ہوسکتا ہے۔

("خبرنامہ" اترپردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ)

ضمیمہ : پانچ

راولپنڈی سازش کیس

۹ مارچ ۱۹۵۱ء کی رات کو فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر کو میجر جنرل اکبر خاں اور کئی فوجی افسروں کے ساتھ لیاقت علی خاں حکومت کا تختہ الٹنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ فیض صاحب اس وقت پاکستان ٹائمز (انگریزی) اور اردو "امروز" کے ایڈیٹر تھے۔ اور سجاد ظہیر پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ کیس راولپنڈی سازش کیس کے نام سے مشہور ہوا۔ فیض صاحب نے کل ملا کر چار سال ایک ماہ گیارہ دن جیل کاٹی۔ پہلے تین ماہ تنہائی میں سرگودھا اور لائل پور کی جیلوں میں کاٹے۔ پھر منٹگمری سنٹرل جیل، پھر لاہور، اس کے بعد سندھ حیدرآباد اور آخر میں کراچی کی جیلیں کاٹنے کے بعد وہ ۲۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو رہا ہوئے۔

جیل کے اندر کے حالات تو فیض صاحب کے ساتھیوں نے لکھے ہیں لیکن سازش کیس کی تفصیل پوری طرح سے کسی تاریخ دان نے قلمبند نہیں کی۔

طارق علی نے اپنی کتاب CAN PAKISTAN SURVIVE (کیا پاکستان زندہ رہے گا) میں اس کیس کے بارے میں یوں لکھا ہے:

"پاکستان کی نوعمر کمیونسٹ پارٹی اس منصوبے میں اس وقت

ملوث ہوئے جب سجاد ظہیر ایک کاک ٹیل پارٹی میں میجر جنرل اکبر خان سے ملے۔ جنرل نے ان سے مجوزہ بغاوت کے مسئلہ پر بات کی اور ان سے مینی فیسٹو ڈرافٹ کرنے اور ہٹ لسٹ تیار کرنے کی درخواست کی۔ کمیونسٹ قیادت نے اس کی تائید کی اور فوجی افسروں کے ساتھ کئی نشستوں میں شرکت کی۔ پھر یہ طے پایا کہ کچھ دنوں کے لیئے اس منصوبے کو التوا میں رکھا جائے لیکن فوجی سازش کاروں میں سے ایک نے اس خوف سے کہ شاید حقیقت کھل جائے سرکاری گواہ بن کر سب اگل دیا۔ سب سازشی گرفتار کر لیے گئے۔

طارق علی بائیں بازو کے سیاسی ادیب ہیں اور لندن میں رہتے ہیں۔ فیض صاحب حالانکہ کیمونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں تھے لیکن کیمونسٹ پارٹی سے ان کی ہمدردی کوئی پوشیدہ نہ تھی۔ وہ ڈاک تار ورکرز یونین کے پریذیڈنٹ تھے۔ اور پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر۔ ویسے بھی پاکستان ٹائمز کے اداریے بائیں بازو کی سیاست کی نمائندگی کرتے تھے۔
مقدمے کی سماعت دسمبر ۱۹۵۲ء تک رہی۔ فیصلہ ۵ جنوری ۱۹۵۳ء میں سنایا گیا ـــــ بقول سید سجاد ظہیر: ـــــ

"ہمیں روز روز اسپیشل ٹریبونل کے اجلاس میں جا کر ملزموں کے کٹہرے میں گھنٹوں بیٹھے رہنے اور اس دوران گواہوں کی شہادتوں، وکیلوں کی جرح اور بحث اور معزز ججوں کی فاضلانہ قانونی موشگافیوں سے نجات مل گئی تھی۔ ابھی فیصلہ نہیں سنایا گیا تھا اور ہم امید و بیم کے عالم میں تھے۔" حقیقتی" دافر تھی۔ انہی دنوں جیل میں ایک اطلاع ملی کہ "دست صبا" شائع ہو گئی ہے۔ گو ہم اس کی تمام چیزیں فیض صاحب کے منہ سے سن چکے تھے اور انھیں بار بار پڑھ چکے تھے۔ لیکن اس خبر سے ہم سب میں سے تمام ان قیدیوں کو جو ادب سے مس رکھتے تھے، ایک غیر معمولی مسرت ہوئی۔ جیل کے حکام سے اجازت لے کر ہم نے ایک پارٹی بھی کر ڈالی جس میں ہم تمام قیدیوں نے مل کر فیض کو "دست صبا" کی اشاعت پر مبارکباد دی۔

اس موقع پر ہنستے ہوئے اور باتوں کے میں نے یہ کہا تھا کہ بہت عرصہ گزر جانے کے بعد جب لوگ راولپنڈی سازش کے مقدمے کو بھول جائیں گے اور پاکستان کا مورخ ۱۹۵۲ء کے اہم واقعات پر نظر ڈالے گا تو غالباً اس سال کا سب سے اہم تاریخی واقعہ نظموں کی اس چھوٹی سی کتاب کی اشاعت کو ہی قرار دیا جائے گا۔

سجاد ظہیر کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت نہیں ہوئی۔ کیونکہ پاکستان کا مورخ آج یہ مانگ کر رہا ہے کہ راولپنڈی سازش کیس کے حقائق کھل کے سامنے آجانے چاہییں۔ پاکستان کا مورخ یہ بھی ماننے کو تیار نہیں کہ ۱۹۵۲ء کا سب سے اہم تاریخی واقعہ "دست صبا" کی اشاعت ہے۔

فیض اور سجاد ظہیر کے علاوہ دوسرے لوگ جو نظر بند اور قید کیے گئے ان کے نام ہیں:

۱۔ میجر جنرل اکبر خاں۔
۲۔ بیگم نسیم اکبر خاں۔
۳۔ کرنل نیاز احمد ارباب۔
۴۔ میجر اسحاق احمد
۵۔ ضیاء الدین۔
۶۔ کیپٹن خضر حیات۔
۷۔ ظفر اللہ پوشنی۔
۸۔ جنرل نذیر احمد "ہندی" والے۔
۹۔ ایئر کموڈور محمد خاں جنجوعہ عرف "مارشل"
۱۰۔ بریگیڈیر لطیف
۱۱۔ محمد حسین عطا۔
۱۲۔ میجر حسن خاں۔
۱۳۔ بریگیڈیر صدیق۔

۵ جنوری ۱۹۵۳ء کو سزائیں سنائی گئیں۔ جنرل نذیر کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اور برخاست عدالت کی سزائے قید سنائی گئی۔ اسی دن ان کو رہا کر دیا گیا۔ نسیم بیگم کو بھی رہا کر دیا گیا۔

باقی تیرہ مجرموں کو چار سال سے لے کر بارہ سال تک قید کی سزا سنائی گئی۔

فیض صاحب نے مختلف جیلوں سے اپنی بیوی کو ۱۲۵ خطوط لکھے۔ کسی ایک خط میں راولپنڈی سازش کیس کا ذکر نہیں ہے۔ دوستوں کا کہنا ہے کہ جب بھی اس کیس کا ذکر ہوا ہے فیض بات کو ٹال گئے۔

"باغیوں" کے وکیل شہید سہروردی تھے۔ قانونی نکات میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ جنرل اکبر خاں کی گرفتاری کے وقت ایسا پردہ فاش ہوا جس پر انگریزی میں لکھا تھا G.G. Should be removed گورنمنٹ کا یہ کہنا تھا کہ یہ ایک خفیہ آرڈر تھا جس کا مطلب صاف تھا کہ پاکستان کے گورنر جنرل کو صاف کر دیا جائے۔ کیس کی سماعت کے آخری دن سہروردی نے ایک ایسا پانسہ پھینکا کہ سننے والے حیران رہ گئے۔

فرمایا کہ "جنرل اکبر خاں ایک آرمی آفیسر ہیں۔ ممکن ہے کہ انھوں نے گلگت گریزن کو ہٹانے کا آرڈر دیا ہو۔"

راولپنڈی سازش کیس کی سچائی کیا ہے؟

فیض صاحب نے اپنی سوانح عمری نہیں لکھی۔ نہ ہی انھوں نے کبھی اس موضوع پر کھل کے بات کی۔ کسی اور نے بھی فیض کی زندگی کے اس پہلو پر نہیں لکھا۔ جتنی کتابیں چھپی ہیں سب تنقیدی ہیں۔ انٹرویوں میں کچھ ہلکے پھلکے اشارے ہیں۔ کبھی کبھی اپنی نزاکت کا سہارا لیتے ہوئے فیض صاحب کچھ کہہ جاتے تھے۔ لیکن راولپنڈی کیس کے بارے میں ان کے لب آزاد نہیں تھے۔ کہتے ہیں فیض صاحب کسی زمانہ میں طبلہ بجایا کرتے تھے۔ نت نئی طرزیں نکالتے تھے۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ وہ بیڈمنٹن کھیلتے تھے اور کیرکٹر بننا چاہتے تھے۔ اپنی والدہ کے سامنے کبھی سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ اور سنگٹ میں جیوتشی کو بھی اپنی ریکھا دکھا لیتے تھے۔ پھر رب کی کرنی یہ ہوئی کہ وہ راتوں رات "کامریڈ" بن گئے۔ فوج کی کرنلی کی۔ پاکستان ٹائمز کی ایڈیٹری کی۔ گلشن کا کاروبار بڑا اچھا چل رہا تھا کہ یک لخت ۹ مارچ کو سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری کیا تھی گارڈ آف آنر تھی۔ جیل سے باہر وی آئی پی، جیل کے اندر وی آئی پی۔

یہ متاع لوح و قلم کے لطیفے تو کوئی بھی تاریخ دان نہیں مانے گا۔ ان کے "کمیونزم" کا بھی انداز اپنا ہی تھا۔ پکے غازی تو نہیں تھے لیکن اسلام پر انھیں ناز تھا۔ ان کی تعلیم حفظِ قرآن سے شروع ہوئی۔ جیل میں قیدیوں کو قرآن پڑھایا۔ انتقال سے کچھ دن پہلے کالا قادر اپنے آبائی گاؤں کی مسجد میں جب گئے تو مغرب کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ امام مسجد سے اجازت لے کر فیض صاحب نے نماز کی امامت کی۔ اس طرح فیض صاحب مُلاؤں میں بھی اتنے ہی ہردل عزیز تھے جتنے سیاست دانوں میں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فیض صاحب اس کیس میں بالکل معصوم تھے۔ اور کچھ لوگ اس
کے بالکل برعکس سوچتے ہیں۔ بہرحال جتنی دیر تک اس کیس کی تفصیل شائع نہیں ہو جاتی اس
کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔
اپنے مضمون "فیض آئینہ خانے میں" شیر محمد حمید (افکار نمبر) لکھتے ہیں:

"مارچ ۱۹۵۱ء میں فیض راولپنڈی سازش کیس میں ماخوذ
ہو کر گرفتار ہوئے۔ فوجی افسروں اور جرنیلوں کی دھڑا دھڑ
گرفتاریوں اور کئی غیر فوجی شہریوں کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ کچھ اس
قدر عجلت اور تیزی سے عمل میں آیا کہ سارے ملک میں خوف و
دہشت کی فضا چھا گئی۔ اخبارات نے اس واقعے کو کچھ اس انداز
میں پیش کیا کہ ہر جانب گھبراہٹ اور سراسیمگی پھیل گئی۔ ہر شخص
مشوش اور ہراساں تھا کہ نہ جانے کیا ہونے والا تھا اور خدا معلوم
کیا ہونے والا ہے!!
مجھے فیض کی گرفتاری کی خبر اور اخبارات میں دیے ہوئے
سازش کے بھیانک نقشے نے سراسیمہ کر دیا۔ کچھ عجیب سی بے بسی اور
گومگو کی حالت تھی، کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ادھر صوبائی
اسمبلی کے انتخاب شروع ہو رہے تھے اور اگلے دن میرے گاؤں
کا پولنگ تھا میں مسلم لیگ پارٹی میں شامل تھا اور ایک مسلم لیگی امیدوار
کی حمایت کر رہا تھا۔ سوچا کہ پولنگ کا جھمیلہ نمٹا کر لاہور جاؤں گا اور
فیض کے گھر جا کر دریافت احوال کروں گا۔ چار پانچ دن میں ادھر
سے فراغت ملی تو لاہور پہنچا۔ اور بیگم فیض سے حالات پوچھے وہ
بے چاری بالکل بے خبر اور اس اچانک افتاد سے سخت گھبرائی ہوئی
تھی۔ اس معاملہ کا اسے کچھ بھی علم نہ تھا۔ بلکہ اس ضمن میں ایک عجیب
لطیفہ ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ رات کے دو بجے کا وقت ہو گا کہ
اچانک میری آنکھ کھل گئی میں نے دیکھا کہ ہمارے کمرہ کی کھڑکی کے
شیشوں پر ٹارچ کی روشنی پڑ رہی ہے جو کبھی بجھ جاتی ہے اور کبھی دائیں
بائیں حرکت کرتی معلوم ہوتی ہے۔ میں بستر سے اٹھی اور کھڑکی کھول

کر نیچے دیکھا۔ نیم تاریکی میں مجھے متعدد آدمی کھڑے اور سرگوشیوں میں باتیں کرتے معلوم ہوئے۔ ان میں سے اکثر اَفسروں، بند وقوں اور پستولوں سے مسلح تھے۔ مارچ کی روشنی چمکی تو پولیس کی وردیاں نمایاں طور پر نظر آگئیں۔ میں نے کھڑکی بند کی اور نفیض کو جگایا اور صورتِ حال واضح کی۔ اُن سے پولیس کی اس بے وقت آمد کا باعث پوچھا۔ مسکرا کر کہنے لگے: ہم اخبار نویسوں کے گھر دن کی آئے دن تلاشیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی قصہ ہوگا! تلاشی کے ذکر سے مجھے یاد آگیا کہ ہماری الماری میں ایک دو بیئر کی بوتلیں رکھی ہیں، ایسا نہ ہو کہ تلاشی کے دوران پکڑی جائیں اور خواہ مخواہ آبکاری احباب کی تواضع کے لیے کسی ضابطہ کے تحت دھر لیے جائیں، اور جگ ہنسائی کا موجب بنیں۔ میں نے دونوں بوتلیں نکالیں اور مکان کے پشت کی جانب دیوار پر دے ماریں۔ بوتلوں کے ٹوٹنے سے جو دھماکہ ہوا تو پولیس کے جوانمرد گھبراہٹ میں پیچھے بھاگے۔ نہ جانے اُنہیں اس دھماکہ سے کیا شبہ ہوا۔

کہتے ہیں کامریڈ فیروزالدین منصور نے جنہیں منٹو فراڈالدین منصور کہتا تھا اپنے آخری ایام میں انقلاب کی باتیں چھوڑ کر ہومیو پیتھی کی باتیں شروع کردی تھیں۔ درجنوں دوسرے انقلابی ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے ہی انقلاب کے اوراق دیمک بن کر چاٹ کھائے۔

ربا سچیا توں تے آکھیا سی
جا اوئے بندیا جگ دا شاہ ہیں توں
ساڈیاں نعمتاں تیریاں دولتاں نیں
ساڈا نیب تے عالی جاہ ہیں توں،
ایس لارے تے ٹور کد پچھیا اسی
کیہہ ایس نمانے تے بیتیاں نیں
کدی سار دی لئی او رب سائیاں
تیرے شاہ نال جگ کیہہ کیتیاں نیں

کتے دھونس پولیس سرکار دی اے
کتے دھاندلی نال پٹوار دی اے
اینویں ہڈاں وچ کلپے جان میری
جیویں پھاہی وچ کونج کرلاندی اے
چنگا شاہ بنایا اسی رب سائیاں
پولے کھاندیاں وار نہ اوندی اے

مینوں شاہی نئیں چاہیدی رب میرے
میں تے عزت دا ٹکر منگناں ہاں
مینوں تاہنگ نئیں، محلاں ماڑیاں دی
میں تے جیویں وی نکرہ منگناں ہاں
میری منّیں تے تیریاں میں مناں
تیری سونہہ جے اک دی گل موڑاں
جے ایہہ مانگ نئیں پجدی تیں ربا
فیر میں جاواں تے رب کوئی ہور لوڑاں

فیض احمد فیض کی ایک یادگار تصویر

مرے کالج سیالکوٹ کے زمانے کی

فیض احمد فیض ۱۹۳۳ء میں
گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے انگریزی کرنے کے بعد

فیض احمد فیض لیکچرار
مسلم اورنٹیل کالج ۔ امرتسر

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

مرزا اسداللہ خاں غالب

ڈاکٹر محمدؐ اقبال

فیض احمد فیض

منشی پریم چند

پہلی کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس لکھنؤ کے موقع پر ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء

فیض احمد فیض
ایڈیٹر پاکستان ٹائمز۔ لاہور

فیض احمد فیض بیگم ایلس اور دونوں بیٹوں کے ساتھ ۱۹۶۱ء لاہور

انگریزی رومانی شاعر جان کیٹس جو فیض کی شاعری پر چھاتے رہے۔

(۱۷۹۵-۱۸۲۱)

سعادت حسن منٹو
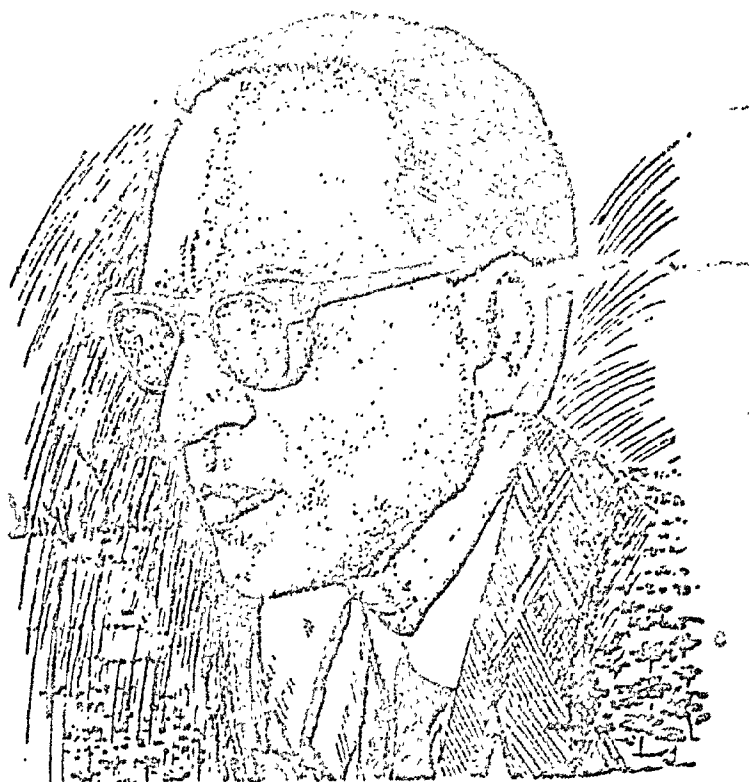
مخدوم محی الدین

فیض احمد فیض ۱۹۶۲ء لینن پیس پرائز کے موقع پر۔
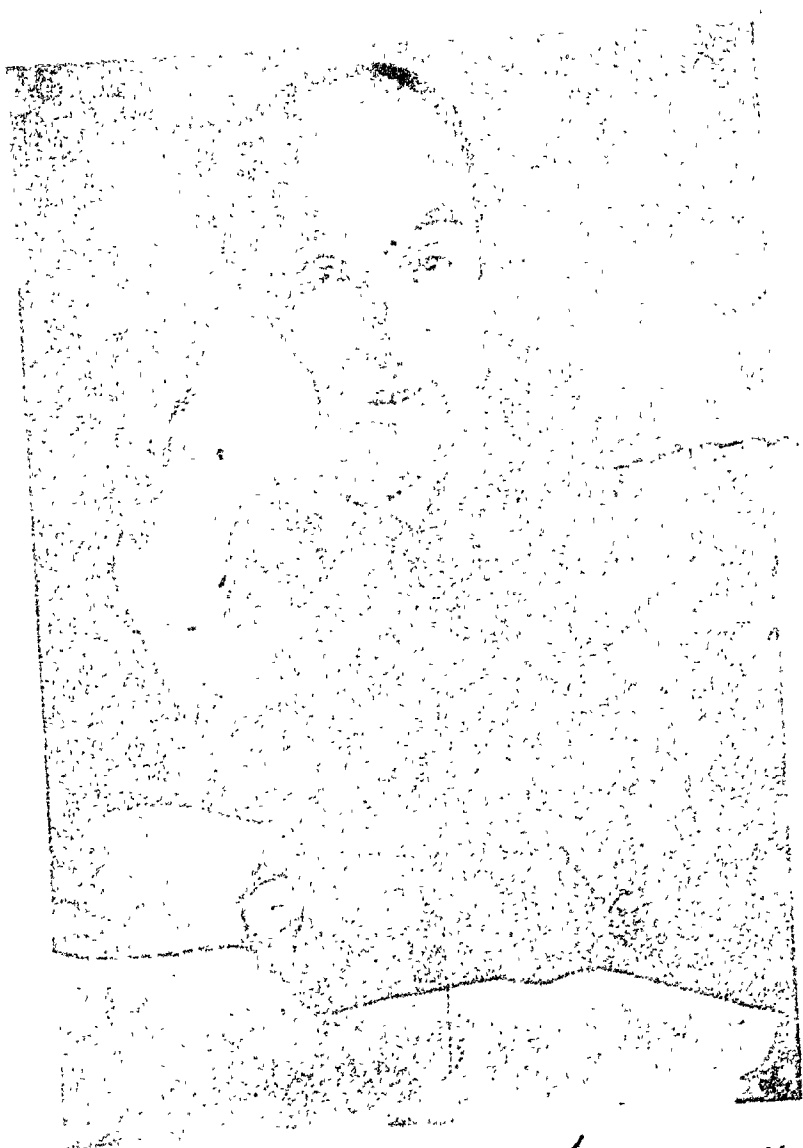
پابلو نرودا، سوچی کے سینا ٹوریم میں سنہ ۱۹۶۲ء میں فیض
ان کے ساتھ ایک مہینہ رہے